ادب اور سماجی نفسیات: پاکستانی تارکینِ وطن کی شاعری میں ناسٹلجیا

مقالہ برائے ایم-فل (اردو)

مقالہ نگار:

محمد فراز خان

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

اگست ۲۰۲۴ء

ادب اور سماجی نفسیات: پاکستانی تارکینِ وطن کی شاعری میں ناسٹلجیا

مقالہ برائے ایم-فل (اردو)

مقالہ نگار:

محمد فراز خان

یہ مقالہ

ایم فل اُردو

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگو یجز

(اُردو زبان و ادب)

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو یجز، اسلام آباد

اگست ۲۰۲۴ء

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے،وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس مقالے کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: ادب اور سماجی نفسیات: پاکستانی تارکینِ وطن کی شاعری میں ناسٹلجیا

پیش کار: محمد فراز خان

رجسٹریشن نمبر: 40/MPhil/Urd/F21

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: (اردو زبان و ادب)

ڈاکٹر نازیہ یونس ____________________

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر جمیل اصغر جامی ____________________

ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

تاریخ: ____________

اقرار نامہ

میں محمد فراز خان اقرار کرتا ہوں کہ مقالہ ہذا بعنوان "ادب اور سماجی نفسیات: پاکستانی تارکینِ وطن کی شاعری میں ناسٹلجیا" میرا ذاتی کام ہے۔ نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد کے ایم فل سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر نازیہ یونس کی زیر نگرانی کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام اس سے پہلے کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں حصول سند کے لیے پیش نہیں کیا ہے اور نہ ہی آئندہ کروں گا۔

محمد فراز خان

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

اگست ۲۰۲۴ء

فہرست ابواب

عنوان	صفحہ نمبر
مقالہ کے دفاع اور منظوری کا فارم	III
اقرار نامہ	IV
فہرست ابواب	V
Abstract	VIII
اظہار تشکر	IX
باب اول: موضوع تحقیق کا تعارف، بنیادی مباحث	۱
الف۔ تمہید	۱
۱۔ موضوع کا تعارف	۱
۲۔ بیان مسئلہ	۲
۳۔ مقاصد تحقیق	۲
۴۔ تحقیقی سوالات	۲
۵۔ نظری دائرہ کار	۲
۶۔ تحقیقی طریقہ کار	۴
۷۔ مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق	۴
۸۔ تحدید	۴
۹۔ پس منظری مطالعہ	۴
۱۰۔ تحقیق کی اہمیت	۵
ب۔ ناسٹلجیا: بنیادی مباحث	۵

۱۔ ناسٹلجیا کا تعارف: جوہانس ہافر اور قاضی جاوید کے تصورات کی روشنی میں ۱۰
۲۔ ناسٹلجیا کے سماجی کردار کی نوعیت: Clay Routledge کے تصورات کی روشنی میں ۲۳
حوالہ جات ۵۲
باب دوم: پاکستانی تارکین وطن کی شاعری میں یادِ ماضی کے عناصر کا تجزیاتی مطالعہ ۵۷
۱۔ یادِ ماضی ۵۸
۲۔ ہجرت کا کرب ۶۱
۳۔ تشخص کی تلاش ۶۵
۴۔ خوشگوار لمحات کی تلاش ۶۸
۵۔ حالات و واقعات کی تلخیاں ۷۰
۶۔ ثقافتی و تہذیبی ورثے سے دوری ۷۳
۷۔ سیاسی و معاشرتی ورثے سے دوری ۷۵
۸۔ انسانی رشتوں کا انہدام ۸۷
۹۔ بے یقینی اور لاتعلقی کا احساس ۸۲
۱۰۔ بیرونی ہجرتیں ۸۶
۱۱۔ اکتاہٹ ۸۹
۱۲۔ اپنوں کی جدائی کا دکھ ۹۱
۱۳۔ دوستوں کی یادیں ۹۳
۱۴۔ عہد طفلی کی یادیں ۹۵
حوالہ جات ۹۸
باب سوم: پاکستانی تارکین وطن کی شاعری میں مراجعت کی خواہش (یادِ وطن) کے عناصر کا تجزیاتی مطالعہ ۱۰۳
۱۔ گھر سے دوری کا احساس ۱۰۵
۲۔ رائیگانی اور لاحاصلی کا دکھ ۱۰۸

۳۔ قوم پرستی ۱۱۰
۴۔ پاکستانیت ۱۱۱
۵۔ حب الوطنی ۱۱۳
۶۔ تہذیبی و ثقافتی تنوع ۱۱۶
۷۔ قدیم آبائی وطن ۱۱۹
۸۔ گزرے لمحوں کی باز آفرینی ۱۲۲
۹۔ جمہوری قدروں کی پامالی ۱۲۴
۱۰۔ شہریت کا مسئلہ ۱۲۵
۱۱۔ قدیم گلیوں، چوراہوں اور پرانے رستوں کی خواہش ۱۲۷
۱۲۔ فطرت پسندی ۱۲۸
۱۳۔ اجنبیت کا احساس ۱۳۱
۱۴۔ ازلی و ابدی نارسائی ۱۳۳
۱۵۔ غریب الدیار ہونا ۱۳۵
۱۶۔ اداسی ۱۳۷
۱۷۔ ستم رسیدگی ۱۳۹
۱۸۔ تنہائی ۱۴۲
حوالہ جات ۱۴۶
باب چہارم: ماحصل ۱۵۱
الف۔ مجموعی جائزہ ۱۵۱
ب۔ تحقیقی نتائج ۱۵۹
ج۔ سفارشات ۱۵۹
کتابیات ۱۶۱

ABSTRACT

The title of my Research, Thesis for my M.Phil. Urdu is "Literature and Social Psychology: Nostalgia in the Poetry of Pakistani Diaspora"

Literature is the mirror of society that is why it accepts the effects of attitudes, inclinations, movements and actions created in a society and expresses these in a particular way. In the 20th century, well identified changes are being found in the sub continent and the parti on of sub continent is prominent among them. It was such a troubling situation which directed every man towards individualism. Topical changes are being found in Urdu literature after Pakistan came in to being. Nostalgia was found which was not a new inclination in Urdu literature. This tradition has been coming from the Wali Dakni to Nasir Qazmi and it is still found in the poetry of the poets exiled from the country.

Nostalgia is literally related to psychology. This is an inclination which takes birth from the hard feelings of the past. First of all, used this form calling it Des Badhka. It has been considered an illness during world War 1 and 2.

Any war which used to dishearten soldiers, it created a wish to return to his own country. But in literature, nostalgia is an action to discover the past which has positive effects on society. Clay Rotalage has discussed it very comprehensively. He has discussed how nostalgia makes the social activities effective creating the spirit of intimacy and increases trust in social capabilities. It helps to search new relationships and encouragement. It helps to control the problems in the existing relationships. It energies the spirit of sympathy which can create the sympathatic society.

The term immigrants is used for those who migrate to other countries and settle down there. After Pakistan came into being, a big number of immigrants migrated to developed countries like British to which migration is still continued. This migration has been done due to educational, political, social, cultural and financial issues. After migrating to British, these immigrants are facing numerous problems which include mixing in new culture, inadequacy with language, freedom of religious rites, and social and moral values. Because of these reasons, the immigrants feel alienation from the environment and become victim of intense isolation and so they feel nostalgia. This can be seen in the Pakistani immigrant poets. Ahmed Mushtaq, Saaqi Farooq, Mansoor Afaq and Ali Arman are the poets whose poetry shows the elements of recollection and remembrance of the country.

اظہار تشکر

تمام طرح کی تعریف اس اللہ کے لئے ہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہر چیز کا مالک ہے اور آخرت میں بھی اسی کے لیے حمد ہو گی اور وہ کمال حکمت والا ہر چیز سے باخبر ہے۔ لہٰذا میں اسی پروردگار کا شکر بجالاتا ہوں جس نے مجھے اس قابل بنایا کہ میں نے تحقیق جیسے دقیق امور کو سرانجام دینے کی ادنیٰ سی کوشش کی ہے۔

اس تحقیقی کام کی انجام دہی میں بہت سے رفقاء نے میرا ہاتھ بٹھایا۔ میں ان سب کا مشکور اور دعا گو ہوں۔ ان میں پروفیسر حبیب گوہر اور فرخ گوندل قابلِ ذکر ہیں۔ بالخصوص اپنی مقالہ نگار ڈاکٹر نازیہ یونس صاحبہ کا انتہائی ممنون و مشکور و مقروض ہوں۔ جنہوں نے ابتدا سے اب تک ہر قدم پر میرا ساتھ دیا، ہر ہر مرحلے پر ان کی شفقت و محبت میرے شاملِ حال رہی اور مجھے جس وقت بھی ان کی ضرورت محسوس ہوئی وہ تمام کاموں کو پس پشت ڈال کر میری مدد کے لیے موجود رہیں۔ اس کے علاوہ شعبہ اردو، نمل کے تمام جملہ اساتذہ کا بھی مشکور ہوں جن سے کورس ورک میں فیض یاب ہوا۔

آخر پر میں اپنے والدین اور بہن بھائیوں، بالخصوص بڑے بھائی ایاز خان کا شکر گزار ہوں۔ جو ہمیشہ میرے لیے دعا گو اور حوصلہ بنے رہے۔ اپنی اہلیہ رومیصہ سہیل کا بھی شکر گزار ہوں جہنوں میری تحقیقی کام میں معاونت کی۔ اس کے علاوہ مجھے وقت اور ایسا ماحول دیا کہ میں سہولت سے کام سرانجام دے سکوں۔

محمد فراز خان

سکالر ایم۔ فِل اُردو

باب اول:

موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث

الف۔ تمہید

i۔ موضوع کا تعارف(TOPIC INTRODUCTION)

مجوزہ تحقیقی مقالہ "ادب اور سماجی نفسیات: پاکستانی تارکین وطن کی شاعری میں ناسٹلجیا" ہے۔ادب ماضی، حال اور مستقبل کا پیش خیمہ ہوتا ہے اور انھی زمانوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے شعرا اور ادیب معاشرے کے حالات و واقعات کو احاطہ تحریر میں لاتے ہیں۔ان میں سے کسی بھی ایک زمانے کو نظر انداز نہیں کرسکتے۔ادب معاشرے میں پیدا ہونے والے رویوں، رجحانات ، تحریکات اور عوامل کو مخصوص انداز میں پیش کرتا ہے۔ادب میں تحقیق و تنقید کے ذریعے نتائج کو سامنے رکھتے ہوئے علوم کی اہمیت و افادیت کا تعین کیا جاتا ہے جس سے معاشرے کو از سرِ نو تشکیل دینے کی سعی کی جاتی ہے۔

مجوزہ تحقیقی مقالے میں ادب اور سماجی نفسیات:پاکستانی تارکین وطن کی شاعری میں ناسٹلجیا کو پیش نظر رکھا ہے۔ناسٹلجیا ایک مخصوص ذہنی کیفیت ہے جسے جنگِ عظیم اول و دوم کے دورانیے میں ایک ذہنی بیماری کے طور پر بھی پیش کیا گیا لیکن عہدِ حاضر میں ناسٹلجیا کو ذہنی مرض سے تعبیر نہیں کیا جاتا بلکہ ماضی کے حالات وواقعات کو خوشگوار اور بعض اوقات ناخوشگوار تاثر کے ساتھ یاد کرنے کا نام ہے۔ادب میں ناسٹلجیا ماضی کو لمحہ موجود میں دریافت کرنے کا نام ہے۔ناسٹلجیا مثبت اور منفی ہر دو اثرات کا حامل ہوتا ہے۔مثبت اثرات کے نتیجے میں سماجی روابط، خود اعتمادی، خوشگواریت اور مستقبل کے متعلق رجائی جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ منفی اثرات کے نتیجے میں عام طور پر شعر وادبا کے ہاں یہ ایک کرب کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔جس سے بہترین تخلیقی فن پارہ جنم لیتا ہے۔

پاکستانی شعرا کی بڑی تعداد سالہاسال سے خلیجی ریاستوں یورپ، امریکہ اور دنیا بھر کے مختلف علاقوں میں مادی آسائشوں کی خاطر مقیم ہیں جہاں انھیں تمام تر سہولیات میسر ہیں لیکن اس کے باوجود ان کو کئی ایک مسائل کا سامنا ہے۔یہی وجہ ہے کہ وہ ماضی کے خوشگوار لمحات میں سانس لیتے نظر آتے ہیں۔ان تارکین وطن شعرا کے ہاں متفرق موضوعات پائے جاتے ہیں تاہم ناسٹلجیا کا رجحان نمایاں نظر آتا ہے۔ مجوزہ موضوع تحقیق کے تحت ان پاکستانی تارکین وطن شعرا کی شاعری میں ناسٹلجیا کے عناصر کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ بالخصوص مجوزہ موضوع تحقیق

میں منتخب شعرا کو اس لیے شامل کیا گیا ہے کیوں کہ مطالعہ کے دوران بہ نسبتاً دیگر شعرا کے ان کے کلام میں ناسٹلجیائی عناصر کی جھلک زیادہ نمایاں تھی۔ اس تحقیق کے لیے دستاویزی طریقہ کار کو اختیار کیا گیا ہے۔ دستاویزی اسلوب تحقیق کو تاریخی اسلوب تحقیق بھی کہا جاتا ہے۔ اس میں تمام دنیا کے واقعات سے بحث کی جاتی ہے۔ تاریخ میں انسان اور زمان کو موضوع بحث بنایا جاتا ہے۔ تاریخ کا معنی سچائی کی تلاش ہے۔ مختصراً یہ کہہ سکتے ہیں کہ تاریخ گزشتہ حالات و وواقعات کا مربوط بیان ہوتا ہے یا ان وضاحت ہوتی ہے۔ جس کو صداقت کے پیش نظر تنقیدی زاویہ نگاہ سے لکھا جاتا ہے۔ تحقیق کے اس طریقے میں دستاویزات اور ریکارڈ کو استعمال کیا جاتا ہے۔ اس لیے اس کو دستاویزی تحقیق کہتے ہیں۔

ii۔ بیانِ مسئلہ (PROBLEM STATEMENT)

دنیا بھر کے ادب میں جذبات کے اظہار کا موثر وسیلہ شاعری کو قرار دیا جاتا ہے۔ دیگر زبانوں کے ادب کی طرح اردو ادب کے شعرا بھی اس کی اہمیت اور افادیت سے بخوبی آگاہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پاک وہند کی تقسیم سے قبل، بعد اور موجودہ گلوبل ویلج میں بھی بہترین وسیلہ اظہار شاعری کو قرار دیا جاتا ہے۔ اردو شعرا، خاص طور پر پاکستانی تارکین وطن کی شاعری میں ناسٹلجیا کے محرکات و عناصر کی موجودگی کے اسباب کیا ہیں؟ اس بات کی اشد ضرورت تھی کہ اس حوالے سے تحقیق کی جائے۔ مجوزہ تحقیقی مقالے میں شامل شعرا پر مختلف جہات کے حوالے سے تحقیق کی جاچکی ہے لیکن ناسٹلجیا کے حوالے سے تحقیق نہیں کی گئی۔ لہٰذا مجوزہ تحقیقی مقالے میں منتخب پاکستانی تارکین وطن کی شاعری میں ناسٹلجیا کو مدِ نظر رکھا ہے۔

iii۔ مقاصد تحقیق (RESEARCH OBJECTIVES)

ا۔ پاکستانی تارکین وطن کی شاعری میں ناسٹلجیا کے محرکات کی نشاندہی کرنا۔

۲۔ ناسٹلجیا کے تحت پاکستانی تارکین وطن کی شاعری میں یاد ماضی اور مراجعت کی خواہش (یادوطن) کے عناصر تلاش کرنا۔

iv۔ تحقیقی سوالات (RESEARCH QUESTIONS)

ا۔ پاکستانی تارکین وطن کی شاعری میں ناسٹلجیا کے محرکات کیا ہیں؟

۲۔ ناسٹلجیا کے تحت پاکستانی تارکین وطن کی شاعری میں یادِ ماضی اور مراجعت کی خواہش (یادِ وطن) کے کون کون سے عناصر موجود ہیں؟

v۔ نظری دائرہ کار (THEORETICAL FRAMEWORK)

ناسٹلجیا کا لفظ پہلی مرتبہ یوہانس ہوفر نے ۱۶۸۸ء میں وطن کی خواہش یا واپسی کے طور پر متعارف کروایا۔ جوزف بنکس کہتے ہیں کہ پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں ناسٹلجیا کو ایک بیماری تصور کیا گیا۔ یہ لفظ جنگ و جدل میں ان سپاہیوں کے لیے استعمال کیا گیا جو دورانِ سفر حالتِ جنگ، گھر جانے کی خواہش میں مبتلا یا دل شکستہ اور اداس تھے۔

یوہانس ہوفر کے بقول:

> "Greek in origin and indeed composed of two sounds, the one of which is Nosos, return to the native land; the other, Algos, signifies suffering or grief; so that thus far it possible from the force of the sound Nostalgia to define the sad originating from the desire for the return to one's native land."

لیکن موجودہ عہد میں اسے ایک بیماری نہیں سمجھا جاتا بلکہ یہ ماضی کے خوشگوار لمحات کی بازگشت ہے۔ قاضی جاوید اپنے مضمون "ناسٹلجیا کے بارے میں چند باتیں" میں لکھتے ہیں:

> "بہت سے دوسرے خیالات و احساسات کی طرح ناسٹلجیا کا احساس بھی ہماری سماجی زندگی کو متاثر کرتا ہے۔ وہ ہمیں ماضی کے لمحوں اور مقالات میں سے ایسے اجزا تلاش کرنے پر آمادہ کرتا ہے جو ہماری موجودہ صورتِ حال کی ناگواری کا مداوا کر سکے۔"

مجوزہ مقالے میں قاضی جاوید کے مذکورہ بالا مضمون کو مدِ نظر رکھتے ہوئے تحقیقی امور سرانجام دیئے ہیں۔ اسی مضمون کی روشنی میں پاکستانی تارکین وطن کی شاعری میں ناسٹلجیا کے عناصر کا تجزیاتی مطالعہ کیا ہے۔

علاوہ ازیں مجوزہ بالا تعریفوں کی روشنی میں ہمارے سامنے ناسٹلجیا کے جو نکات سامنے آتے ہیں ان میں مراجعت کی خواہش اور یاد ماضی شامل ہیں۔ جبکہ یاد ماضی کے اجزا میں ہجرت کا کرب، تشخص کی تلاش، خوشگوار لمحات کی تلاش، خیالات وواقعات کی تلخیاں، ثقافتی اور تہذیبی ورثے سے دوری، سیاسی و معاشرتی روئے سے دوری، انسانی رشتوں کا انہدام، بے یقینی اور لاتعلقی کا احساس، بیرونی ہجرتیں، اکتاہٹ، اپنوں کی جدائی کا دکھ، دستوں کی یادیں اور عہدِ طفلی کی یادیں اور مراجعت کی خواہش میں گھر سے دوری کا احساس، قوم پرستی، لاحاصلی کا دکھ، حب الوطنی، تہذیبی وثقافتی تنوع، نسلی تنوع، قدیم آبائی وطن، گزرے لمحوں کی باز آفرینی، جمہوری قدروں کی پامالی، شہریت کا مسئلہ، قدیم گلیوں چوراہوں اور دوستوں کی ٹولیاں، فطرت پسندی، اجنبیت کا احساس، ازلی اور ابدی نارسائی کا احساس، غریب الدیار ہونا، اداسی، ستم رسیدگی، تنہائی اور زندگی کی لایعنیت شامل ہیں۔ مجوزہ تحقیقی مقالے میں ناسٹلجیا کے مذکورہ بالا عناصر کو تلاش کیا ہے۔

vi۔ تحقیقی طریقہ کار(RESEARCH THROUGH WORK)

مجوزہ موضوع سے متعلق مطبوعات کی جمع آوری، ترتیب، مطالعہ و تجزیہ کیا ہے۔ زیادہ تر شعرا کے بنیادی مآخذ اکھٹے کئے ہیں۔ اس میں دستاویزی طریقہ کار معاون رہا ہے۔

vii۔ مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق(WORK ALREADY DONE)

ناسٹلجیا ایک کثیر الجہت موضوع ہے۔ اردو تحقیق و تنقید میں اس موضوع پر مختلف مضامین، کتب اور مختلف جامعات میں مقالات لکھے جا چکے ہیں۔ ان مقالات میں غزالہ شفیق نے پی ایچ ڈی کا مقالہ "اردو ناول میں ناسٹلجیا: قیام پاکستان کے بعد"، شکیلہ جبین نے پی ایچ ڈی کا مقالہ "انتظار حسین کی ناول نگاری میں ناسٹلجیائی عناصر"، انتل ضیاء کا مقالہ "۱۹۴۷ء کے بعد اردو کے نمائندہ افسانوں میں کرداری ناسٹلجیا کا تنقیدی جائزہ"، سید مظہر حسین شاہ گیلانی کا مقالہ "جدید اردو نظم کا بدلتا منظر نامہ: یوٹوپیا سے ناسٹلجیا تک" اور نبی احمد کا مقالہ "اردو غزل میں ہجرت کا تجزیہ" شامل ہے۔ مذکورہ بالا مقالہ جات مجوزہ تحقیقی مقالے سے الگ ہیں۔

viii۔ تحدید(DE-LIMITATION)

مجوزہ تحقیقی مقالے میں منتخب پاکستانی تارکین وطن کی شاعری میں ناسٹلجیا کو پیش نظر رکھا جائے گا اور ان کا تجزیاتی مطالعہ کیا جائے گا۔ پاکستانی تارکین وطن شعراء پر دیگر موضوعات کے حوالے سے تحقیقی کام ہو چکا ہے۔ ان کی شاعری میں کئی موضوعات ہیں لیکن ناسٹلجیا کے حوالے سے کوئی تحقیقی کام نہیں کیا گیا۔ مجوزہ تحقیق میں ناسٹلجیا

کے دو نکات یاد ماضی اور مراجعت کی خواہش کو مدِ نظر رکھا ہے۔ منتخب پاکستانی تارکین وطن شعراء ساقی فاروقی، منصور آفاق، احمد مشتاق اور علی ارمان شامل تحقیق ہوں گے نیز دیگر تارکین وطن شعرا مجوزہ تحقیق کا موضوع نہیں ہوں گے۔

ix۔ پس منظری مطالعہ (LITERATURE REVIEW)

ناسٹلجیا کا لفظ پہلی مرتبہ یوہانس ہافر نے ۱۶۲۸ء میں وطن کی خواہش یادرد آلود واپسی کے طور پر متعارف کروایا۔ جوزف بنکس کہتے ہیں کہ پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں ناسٹلجیا کو ایک بیماری تصور کیا گیا۔ یہ لفظ جنگ و جدل میں ان سپاہیوں کے لیے استعمال کیا گیا جو دورانِ سفر حالتِ جنگ، گھر جانے کی خواہش یادل شکستہ اور اداس تھے۔ لیکن موجودہ عہد میں اس سے ایک بیماری نہیں سمجھا جاتا بلکہ یہ ماضی کے خوشگوار لمحات کی بازگشت ہے۔ قاضی جاوید اپنے مضمون میں لکھتے ہیں کہ "ناسٹلجیا کا احساس ہماری زندگی کو متاثر کرتا ہے۔" جب کہ مشتاق احمد یوسفی ناسٹلجیا کو لمحہ منجمد یا داستان فسوں گری قرار دیتے ہیں۔ انسان اپنی دیرینہ خواہشات سے چھٹکارا حاصل نہیں کرسکتا۔ فرائیڈ کے مطابق یہ خواہشات کے تحت شعور میں ہمیشہ موجود رہتی ہیں جو الجھن کا سبب بنتی ہیں، خواب اور تحریر کے ذریعے اظہار میں آتی ہیں۔ اردو شاعری میں ناسٹلجیا کسی نہ کسی صورت میں آغاز سے ہی موجود رہا ہے۔ لیکن باقاعدہ طور پر شعراء برصغیر کی تقسیم کے بعد اس رجحان سے متاثر ہوئے۔ ان میں خاص کر وہ شعراء شامل تھے جو ہجرت کرکے ایک خطے سے دوسرے خطے میں آئے تھے۔ ان کا کوئی اہم حصہ ان سے کٹ گیا تھا۔ جنہیں وہ ماضی کی یادوں میں تلاش کرتے تھے۔ اس عہد کا معتبر حوالہ ناصر کاظمی ہے۔

اس تحقیق میں Clay Routledge کی کتاب Nostalgia: A Psychological Resource، انندیا رائے چوہدری کی کتاب Homemaking: Radical Nostalgia and the Construction of a South Asian Diaspora ضمنی طور پر احمد سہیل کی کتاب "اردو افسانے میں ناسٹلجیا" بھی شامل مطالعہ رہے ہے۔ اس کے علاوہ قاضی جاوید کے مضمون "ناسٹلجیا کے بارے میں چند باتیں" اور اس موضوع کے متعلق لکھے جانے والے دیگر مقالہ جات اور کتابیات سے بھی استفادہ کیا ہے۔

x۔ تحقیق کی اہمیت (SIGNIFICANCE OF RESEARCH)

اردو شاعری کی مختلف جہات کے حوالے سے قابلِ قدر تحقیقی کام ہوا ہے۔ لیکن پاکستانی تارکین وطن کی شاعری میں ناسٹلجیا کے حوالے سے کام کرنے کی ضرورت تھی۔ نئ تہذیب و ثقافت تخلیق کار کی فکر میں وسعت

پیدا کرتی ہے۔ ناسٹلجیا کے زیرِ اثر جو نیا ادب تخلیق ہو رہا ہے اس کی نوعیت، تفہیم اور اہمیت مثلاً اس بات کا ادراک کہ ناسٹلجیائی موضوعات کی ادب میں شمولیت سے نئی شعری فضائیں تشکیل پاتی ہیں جن کا مطالعہ نئے قارئین اور محققین کے لیے مفید ہو گا، کو اجاگر کرنے کے لیے مجوزہ تحقیق معاون ثابت ہو گی اس لیے مجوزہ تحقیقی موضوع کا انتخاب کیا گیا تھا۔

ب۔ناسٹلجیا: بنیادی مباحث:

زمانہ تین ادوار میں منقسم ہے جس میں ماضی، حال اور مستقبل شامل ہیں۔ ان میں سے کسی ایک نوع کی اہمیت و افادیت سے منہ نہیں پھیرا جا سکتا۔ تینوں انواع کا آپس میں گہرا انسلاک ہے۔ انسانی فطرت کا اگر غائر مشاہدہ کیا جائے تو اس بات کا ادراک ہوتا ہے کہ انسان ہمیشہ اپنے حال سے ماضی کو بہتر گردانتا آیا ہے۔ ہر کٹتا ہوا لمحہ اس کے ماضی کا حصہ بنتا ہے۔ انسان اپنے ماضی سے کسی قیمت آنکھیں چرا نہیں سکتا۔ ماضی چاہے حسین یادوں کا استعارہ ہو یا ناخوشگوار یادوں پر مشتمل ہو۔ فرد حال سے بیزاری کے سبب ماضی میں پناہ لیتا ہے جو وقتی راحت و سکوں کا موجب بنتا ہے۔ لیکن اگر راحت و سکون، مثبت قوت کے بل بوتے پر حاصل ہو تو یہ حال کی نہ صرف از سر نو تشکیل کرتا ہے بلکہ خوشگوار مستقبل کے لیے بنیادیں بھی فراہم کرتا ہے۔ عام طور پر یہ مشاہدے میں آتا ہے کہ انسان اپنے حال کے سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی حالات و واقعات سے بیزار دکھائی دیتا ہے۔ وہ ان حالات و واقعات سے کچھ دیر کے لیے فرار چاہتا ہے۔ یہ فراریت اسے کسی ایسی محفوظ پناہ گاہ کا متلاشی بناتی ہے جہاں اسے عارضی یا دائمی راحت و سکوں میسر آ سکے۔ اس کو ماضی کے سوا کوئی اور ٹھکانہ نہیں ملتا جہاں خوشگوار یادیں اسے ذہنی راحت و سکون دیتی ہیں۔

ادب عصری آگہی اور تہذیبی و ثقافتی حسیات کی نمائندگی کرتا ہے۔ جو معاشرے میں پیدا ہونے والے مختلف رویوں، رجحانات، تحریکات، اور عوامل کا نہ صرف عمیق مشاہدہ کرتا ہے بلکہ اس کے اثرات کو بھی قبول کرتا ہے اور ان کا جاندار اظہار بھی کرتا ہے۔ جہاں تک تخلیق کار کا تعلق ہے وہ اسی معاشرے کا فرد ہوتا ہے۔ جو کہ ایک حساس طبعیت کا مالک ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سماجی کرب و جوار کو شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے اور اس کا شعوری طور پر برملا اظہار کرتا ہے۔

دنیا بھر کے ادب میں ناسٹلجیائی جذبات پائے جاتے ہیں۔ اگر اردو ادب پر نگاہ دوڑائی جائے تو اس کی داغ بیل ہندوستان کی سرزمین پر پڑی ہے۔ لہذا ہندوستان کی سرزمین میں ہونے والی سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی

اور جغرافیائی تبدیلیاں کی جھلک یہاں کے ادب میں ملتی ہے۔ اگر بغور ادب کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم پڑتا ہے کہ باقاعدہ تقسیم ہند کے وقت ہونے والی معاشرتی تبدیلیوں نے سماجی سطح پر ایک نئے کرب کو جنم دیا۔ یہ ہجرت، نظریہ کے پس پشت جغرافیائی بنیادوں پر ہوئی جس نے فرد کو داخلی سطح پر شکست و ریخت کا شکار بنایا۔ جو بعد از تقسیم حال سے بیزاری کا موجب بنی جس نے فرد کو تشخص کی راہ پر گامزن کیا۔ یہ تشخص اسے ماضی میں پوشیدہ ملا۔

ڈاکٹر قمر رئیس رقمطراز ہیں: ”قوموں کا تہذیبی تشخص ان کی تاریخ اور افراد کا تشخص ان کے ماضی میں پنہاں ہوتا ہے۔“[۱] مذکورہ بالا اقتباس کی روشنی میں قوموں کی شناخت کے لیے تاریخ کے اوراق الٹنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جبکہ فرد کے لیے ماضی کی اہمیت اجاگر ہوتی ہے کہ ضرورت اس امر کی ہے کہ فرد اپنے تشخص کے لیے ماضی کی کھڑکی کو وا کرے۔ قیامِ پاکستان کے بعد شعراء و ادبا اس نئے احساس سے روشناس ہوئے جس نے انہیں ماضی کی طرف دھکیلا۔ اس نئے احساس سے اردو ادب میں موضوعاتی تنوع پیدا ہوا۔ جس سے حب الوطنی، قوم پرستی، معاشرتی اصلاح اور ناسٹلجیائی رحجان نے فروغ پایا۔ ان سب میں ناسٹلجیا ایک نیا رحجان تھا جو پہلی بار اردو ادب میں شدت کے ساتھ محسوس کیا گیا۔ جس کی بنیاد ہجرت کے تجربے پر رکھی گئی۔

ناسٹلجیا سے قبل یوٹوپیا اور ڈسٹوپیا کی اصطلاحوں کا اجمالی جائزہ لینا بحد ضروری ہے جس کے بغیر ناسٹلجیا کو سمجھنا بے سود ہے۔ یوٹوپیا کی اصطلاح کو سب سے پہلے سر تھامس مور نے ۱۵۱۴ء میں اپنی تصنیف "یوٹوپیا" میں استعمال کیا جسے ایک نئی دنیا میں افسانوی جزیرے کے لیے برتا گیا۔

ابوالاعجاز حفیظ صدیقی رقمطراز ہیں: ”یوٹوپیا کے لغوی معنی ہیں 'کہیں نہیں' کے ہیں گویا یوٹوپیا ایک مثالی ریاست ہے جو خارج میں کہیں وجود نہیں رکھتی۔“[۲]

گویا مذکور بالا ریاست پر جنت کا گماں گزرتا ہے۔ اردو ادب میں یوٹوپیا کے لیے 'جنت ارضی کا لفظ بھی مستعمل ہے۔ ویکیپیڈیا میں رقم ہے: ”یوٹوپیا عام ایک خیالی برادری یا معاشرے کی وضاحت کرتا ہے جو اپنے اراکین کے لیے انتہائی مطلوبہ یا قریب قریب بہترین خصوصیات رکھتا ہے۔“[۳]

اول اور موخر الذکر تعریفوں کو پیش نظر رکھ کر ذہن میں ایک مثالی ریاست کا تصور ابھرتا ہے۔ اس مثالی ریاست یا معاشرے کا تصور خیالی نہیں بلکہ ایک ایسا نظام حکومت ہے جو دیگر ریاستوں سے زیادہ انسان دوست نظامِ حکومت ہے۔ جس کا تعلق ماضی کے کسی معاشرے یا ریاست سے بھی ہو سکتا ہے۔ ادباء و شعرا کے نزدیک

یوٹوپیا خیالات کا تعلق مستقبل سے ہوتا ہے۔ یہ خیالات حال کے حالات و واقعات سے بیزاری کے سبب پیدا ہوتے ہیں۔ تیسری دنیا کے ادباء شعرا کے ادب میں مغربی مثالی معاشروں کا تصور یوٹوپیا کے زمرے میں آتا ہے۔

ڈسٹوپیا کی اصطلاحی یوٹوپیا کی متضاد ہے۔ اس اصطلاح کو سب سے قبل اٹھارویں صدی میں جان سٹوارٹ مل کی دارالعلوام میں کیا گیا۔ جس کے معنی 'ناقص' کے ہیں۔ ڈکشنری ڈاٹ میں رقم ہے: "ایسے سماج کے ہیں جو بدحالی، بد اخلاقی، جبر، لاچاری اور آبادی کے سلسلے میں بے پناہ گنجانی کی خصوصیات رکھتا ہے۔"(۴)

ڈسٹوپیا سماج کا تعلق عام طور پر عہد حاضر سے ہوتا ہے بالخصوص ترقی پذیر معاشروں کے نامساعد حالات و واقعات ڈسٹوپیا سماج کے عکاس ہیں۔ ایسے سماج کے ادباء شعراء کی تحریروں میں ڈسٹوپیا موضوعات کا تنوع پایا جاتا ہے۔ جو حال پر نوحہ کناں ہوتے ہیں جبکہ مستقبل سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔ ناسٹلجیا کی اصطلاح علم نفسیات سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ ایک نفسیاتی رحجان ہے جو ماضی کے شدید احساس سے جنم لیتا ہے۔ ناسٹلجیا کا لفظ سب سے پہلے "یونس ہافر" نے ۱۶۶۸ء میں بازل یونیورسٹی، سوئزرلینڈ کے ایک مقالے میں "دیس ہڑکا" کے معنوں میں برتا۔ علم نفسیات میں اس اصطلاح کو بیماری کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اس بیماری میں مریض نفسیاتی اور ذہنی طور پر اپنے حال سے بیگانہ ہوتا ہے۔ وہ حال میں اپنے گزرے ہوئے ماضی کا متلاشی رہتا ہے۔ لمحہ بہ لمحہ رفتگاں کی کرب ناک یادیں اسے اپنی گرفت میں رکھتی ہیں۔ جوزف بنکس کے نزدیک جنگ عظیم اول اور دوم میں یہ ایک بیماری ہی تصور کی جاتی رہی ہے۔ یہ بیماری عام طور پر ان جنگی سپاہیوں میں پائی جاتی تھی جو ایک عرصے تک گھر سے دوری اختیار کیے ہوئے تھے۔ اس دوری اور مسافرت نے ان کو دل برداشتہ کر دیا تھا۔ جس سے ان کے اندر گھر واپسی کی شدید خواہش نے سر اٹھایا۔

ناسٹلجیا کی اصطلاح کو مزید سمجھنے کے لیے اس کے لغوی، اصطلاحی معانی اور محققین کے نقطہ نگاہ سے استفادہ کرنا ضروری ہے۔ آکسفورڈ انگلش اردو ڈکشنری میں رقم ہے: "ماضی کی حسرت ناک یادیں، ماضی کی یاد دلانے والی شے یا اشیاء، گھر کی یاد، گھر سے دوری کا شدید احساس"(۵)

کیمرج ڈکشنری میں رقم ہے: "ناسٹلجیا، پر مسرت اور خفیف سے مضموم جذبات ہیں جو اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب ماضی میں ہونے والے واقعات کے بارے سوچے"(۶)

آکسفورڈ ایڈوانس لرنرڈ ڈکشنری میں رقم ہے: "خوشی کی آمیزش رکھنے والے ان مضموم جذبات کے ہیں جو ماضی کے کسی خوش گوار وقت کو یاد کرنے سے ابھرتے ہیں۔"(۷)

ایڈوانس پریکٹیکل ڈکشنری میں رقم ہے:"Nostalgia: N. Homesickness وطن یا گھر سے دور، وطن یا گھر کی یاد، یادِ وطن کا عارضہ، وطن واپس جانے کی خواہش، ماضی پرستی۔"(۸)

ڈکشنری آف سائیکالوجی میں رقم ہے:

"According to contemporary theories of human memory ,once input information has been processed or interpreted in a seasonably deep fashion the understanding system thus long term memory is presumed to be without limit either in capacity to store information or induration of that which is stove."(9)

ڈاکٹر اسلم پرویز رقمطراز ہیں:

"ناسٹلجیا ایسی چیز ہے جس سے کسی انسان کو مفر نہیں۔اس کے لیے کسی خاص ذہنی سطح کی بھی قید نہیں۔یہ کم وبیش ہر شخص کا مقدر ہے خواہ وہ کوئی دانش ور ہو یا عام آدمی۔ہاں فردِ واحد کے ہاں اس کے درجات مختلف ہوسکتے ہیں۔اس کے انفرادی جذبات اوراحساسات کے تعلق سے۔ناسٹلجیا کی ایک عام سطح تو ماضی کی یادیں ہے۔اس سے کچھ اوپر کی سطح، کچھ لوگوں کے ہاں اپنے ماضی میں جینے کا رجحان ہے، جسے انگریزی میں "Living in one's past" کہا جاتا ہے۔ایسا کرب جو اس کی قوت بن جاتا ہے۔جس سے اس کو کسی ادبی شاہکار کو جنم دینے میں مدد ملتی ہے۔مخصوص تاریخی حالات میں جب ہم کسی سماجی اتھل پتھل کا شکار ہوتے ہیں اور اس کے نتیجے میں آبادیاں ،شرنارتھیوں اورمہاجروں کی شکل میں ادھر ادھر منتقل ہوتی ہیں تو اس جبر سے ماضی کی زندگی ایک کتھارس بن کرعام آدمی کو اس طرح کچو لتی ہے جو بصورت دیگر صرف مردم آگاہی کا مقدر ہوتا ہے۔نقل مکانی یا ترک وطن کی صورتِ حال کی، جس کے پیچھے ناسٹلجیا کی لڑی بندی ہوتی ہے۔دو صورتیں ہوتی ہیں۔ایک صورت تو وہ، جہاں ہم حالت کے ہاتھوں اپنی رضاو رغبت کے بغیر گھر اور وطن چھوڑنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ایسا برصغیر میں تقسیم وطن کے بعد پیش آیا۔دوسری صورت اسی برصغیر میں برس ہابرس بعد وہ پیدا ہوتی جہاں ملکی باشندوں نے اپنی مرضی سے اورمادی آسائشوں کی خاطر ترقی یافتہ ملکوں کی جانب مراجعت شروع کی جس کے نتیجے میں مادی خوش حالی کے ساتھ انہیں تہذیبی اور سیاسی بحران ،اجنبی پن کے احساس اور شناخت کے مسائل نے آگھیرا۔"(۱۰)

احمد سہیل رقمطراز ہیں:

"ناسٹلجیا کا مفہوم غالباً ہمارے یہاں "خانہ اداسی" سے لیا جاتا ہے جو یکسر غلط ہے۔ خانہ اداسی سے مراد "homesickness" ہے نہ کہ ناسٹلجیا جو بظاہر لاطینی لفظ معلوم ہوتا ہے۔ حقیقتاً دو یونانی الفاظ "Nostos" بمعنی "واپسی" اور "Algos" جس کے معنی "درد آلود واپسی" ہو گا اس اعتبار سے لفظ ناسٹلجیا کو ہم "پس کربیہ" بھی کہہ سکتے ہیں۔ مگر یہ کرب ماضی کی جانب واپسی سے مشروط و منسوب ہے۔"[11]

مذکورہ بالا تعریفوں کو پیش نظر رکھ کر دیکھا جائے تو ناسٹلجیا نفسیاتی یا ذہنی بیماری کے معانی کے جمود کو توڑ کر ایک کثیر الجہتی معنی رکھتا ہے۔ جسے ماضی کے خوشگوار لمحات اور بعض اوقات ناخوشگوار لمحات سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ انسان کسی ایک زمانے سے تعلق منقطع کر کے نہیں رہ سکتا۔ تینوں زمانے آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔ دیگر دو زمانوں کی اہمیت کے حوالے سے یوٹوپیا اور ڈسٹوپیا کی اصطلاحوں پر سیر حاصل گفتگو مذکورہ بالا پیرگراف میں ہو چکی ہے۔ ناسٹلجیا کے حوالے سے انسان کی زندگی میں 'ماضی' کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔ جو شخص حال سے بیزار ہو کر ماضی کی بھول بھلیوں میں کھویا رہتا ہے وہ ناسٹلجی کہلاتا ہے۔ ادب میں ناسٹلجیا لمحۂ موجود میں ماضی کی کھوج لگانے کا عمل ہے۔ ادباء و شعراء اپنی حساسیت کی بنا پر ماضی سے ایک خاص انسیت رکھتے ہیں۔ ماضی یادوں کا مرقع ہوتا ہے۔ یہ یادیں مثبت اور منفی اثرات کی حامل ہوتی ہیں۔ ماضی میں جھانکنے کا عمل نہایت دشوار گزار عمل ہے لیکن یہ اپنے اندر ایک تجربہ رکھتا ہے۔ جو حال کو بہتر بنانے اور روشن مستقبل کو بنیادیں فراہم کرتا ہے۔ مثبت اثرات سے خود اعتمادیت، خوشگواریت اور سماجی میل جول جیسے جذبات پنپتے ہیں جبکہ منفی اثرات سے یہ ایک کرب کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ادباء شعراء اپنی تخلیق میں ان دونوں صورتوں کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن عموماً ناسٹلجیا کو خوشگوار یادوں کے استعارے کے طور پر ہی برتا اور پرکھا جاتا ہے۔ جس سے حال کی ناآسودگیوں سے چھٹکارا حاصل کیا جاتا ہے۔ جو ایک خوشگوار احساس پیدا کرتا ہے۔ یہ احساس ان کے اندر ایک نئی روح پھونک دیتا ہے۔ اب تک کی مباحث کو مدنظر رکھ کر ناسٹلجیا کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ ناسٹلجیا ایک نفسیاتی بیماری

۲۔ مراجعت کی خواہش

۳۔ یادِ ماضی

ذیل میں ان اقسام پر سیر حاصل بحث کی جائے گی جس سے ناسٹلجیا کو مزید سمجھنے میں مدد ملے گی۔

ا۔ جوہانس ہافر اور قاضی جاوید کے تصورات کی روشنی میں:

i۔ ناسٹلجیا ایک نفسیاتی بیماری:

ناسٹلجیا کا تعلق علم نفسیات سے ہے۔ یہ اصطلاح ذہنی امراض میں مبتلا افراد کے علاج کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ جس میں مریض حال میں رہتے ہوئے ماضی میں سانس لیتا ہے۔ وہ ماضی کی کرب ناک یادوں میں کھویا رہتا ہے۔ یہ کرب ناکی کبھی کبھی اس کے لیے وبال جان بن جاتی ہے۔ جہاں وہ اپنے حافظے کے چھین جانے کی دعا کرتا ہے۔ اختر انصاری نے کہا تھا:

یادِ ماضی عذاب ہے یارب

چھین لے مجھ سے حافظہ میرا [۱۴]

ادب سماج کا عکاس ہوتا ہے جبکہ ادب اور نفسیات کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ ادب سماجی و تہذیبی سطح پر رونما ہونے والی تبدیلیوں اور ان تبدیلیوں سے نفسیاتی سطح پر پیدا ہونے والی کشمکش کا اظہار کرتا ہے۔ ادب حالات وواقعات کا جائزہ لینے کے لیے تاریخ کا مطالعہ کرتا ہے۔ تاریخ کا تعلق ماضی سے ہوتا ہے۔ ماہر نفسیات فرائیڈ کے مطابق انسان جن خواہشات کا اظہار نہیں کرپاتا وہ خواہشات اس کے اندر دب جاتی ہیں۔ وہ نفسیاتی سطح پر مختلف کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ادب انہی خواہشات کا اظہار ہے۔ فرائیڈ نے ۱۸۹۰ء میں نظریہ تحلیل نفسی میں اس موضوع پر جامع بحث کی ہے۔ انہوں نے انسانی ذہن کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ جس کو انہوں نے ایڈ، ایگو اور سپر ایگو (فوق الانا) کا نام دیا۔ اردو میں اس کے لیے شعور، تحت الشعور اور لاشعور کی اصطلاحیں استعمال ہوتی ہیں۔ یہ قوتیں ایک دوسرے کے متصادم کام کرتی ہیں۔ ایڈ فورا خواہشات کو پورا کر کے فرحت کے جذبات سے محظوظ ہوتا ہے۔ یہ فرد کا ارتقاء کے اول دنوں سے ساتھ نبھاتا ہے۔ اس کو حقیقت اور اخلاقی تقاضوں سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ یہ انجام سے بے خبر ہوتا ہے۔ جو ماحول کی پرواہ نہیں کرتا جبکہ دوسری قوت ایگو ہے۔ یہ فرد میں آگہی اور ماحول سے مطابقت پیدا کرنے والی اہم قوت ہے۔ جو کہ ایڈ کے لیے لگام کا کردار ادا کرتا ہے۔ ایگو کردار کو تو قابو کرتا ہے لیکن اخلاقی پہلو سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک تیسری قوت سر اٹھاتی ہے جس کو سپر ایگو کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ قوت فرد کے کردار میں اخلاقی پہلو پر توجہ دیتی ہے۔ جس کا کام تعمیری ہوتا ہے۔ جو کہ تہذیبی و ثقافتی نشوونما میں کارآمد ثابت ہوتی ہے۔ سپر ایگو کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ ایڈ اور ایگو کے درمیان

مفاہمت کا کردار ادا کرتا ہے۔یہ دونوں قوتیں انتہائی سطح پر ایک دوسرے کی متصادم ہیں۔ایک قوت ہر طرح کی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے کسی قسم کا اقدام اٹھانے سے گریز نہیں کرتی جبکہ دوسری اخلاقی سطح پر ماحول سے مطابقت پیدا کرنے کے لیے لچک کا مظاہرہ نہیں کرتی۔

ڈاکٹر انور سدید نے فرائیڈ کے نظریے تحلیل نفسی پر رقمطراز ہیں:

> ”فرائیڈ کا بنیادی نظریہ جنسی قوت یا لیبڈو پر مبنی ہے۔اڈ نفس قوت کا سرچشمہ ہے۔اسے معروضی حثیت کا علم تک نہیں ہوتا۔یہ انسانی تجربے کے بارے میں صرف یہ جاننا چاہتا ہے کہ وہ درد بخشتا ہے یا لذت۔اڈ کے دائرے کے اندر ایگو اور سپر ایگو ایک دوسرے سے ممیز کرتا ہے۔ایگو ذہن کے اندر اشیاء کو خارجی دنیا کی اشیاء سے ممیز کرتا ہے۔تجربے کے بارے میں ایگو صرف یہ پوچھتا ہے کہ وہ سچ ہے یا جھوٹ۔ایگو جبلی ضروریات اور خارجی ماحول میں گویا رابطہ قائم کرتا ہے۔سپر ایگو معاشرے کے اقدار کی نمائندگی کرتا ہے یہ گویا شخصیت کا اخلاقی پہلو ہے اور تجربے کے بارے میں صرف یہ دریافت کرتا ہے کہ وہ اچھا ہے یا برا۔“(۱۳)

مجوزہ بالا اقتباس سے فرائیڈ کے نظریے کی روشنی میں ادب کو ایک نئے زوایے نگاہ سے دیکھا اور پرکھا جاسکتا ہے۔جس میں ادباء اور قاری دونوں محظوظ ہوتے ہیں۔ادباء دبی ہوئی خواہشات سے پیدا ہونے والی نفسیاتی کشمکش کا اظہار اپنی تحریروں میں کرتے ہیں۔جبکہ قاری ان تحریروں کو پڑھ کر اپنا کتھارسس کرتے ہیں۔

ii۔مراجعت کی خواہش:

انسان جس مٹی یا وطن میں آنکھ کھولتا ہے اس وطن سے اس کی قربت انسانی سرشت میں شامل ہوتی ہے۔یہ قربت فرد میں حب الوطنی کے جذبات پیدا کرتی ہے۔وہ ہر لمحہ وطن کی محبت میں مرمٹنے کو تیار رہتا ہے۔اسے ایک لمحہ وطن سے دوری برداشت نہیں ہوتی۔اگر کسی صورت میں اسے وطن سے دور رہنا پڑجائے تو یہ فرقت تکلیف دہ عمل کے ساتھ فرد کو دل شکستہ اور اداس کر دیتی ہے۔وہ وطن کے فراق میں خون کے آنسو روتا ہے۔اس خوشگوار لمحات کی یادیں رہ رہ کر ستانے لگتی ہیں۔اور کہیں اندر ہی اندر وطن واپسی کی شدید خواہش پیدا ہوتی ہے۔ایسے حالات میں فرد ناسٹلجیا کا شکار ہو جاتا ہے۔

جنگ وجدل کے زمانے میں ناسٹلجیا کی مزکورہ کیفیت شدید احساس کے ساتھ وقوع پذیر ہوتی ہے۔ایسے حالات میں ہر دوسرا شخص ناسٹلجیائی دکھائی دیتا ہے۔لیکن یہ احساس سب سے زیادہ جنگی سپاہیوں کو متاثر

کرتا ہے۔ جن کو مدتوں وطن اور گھر سے دوری اختیار کرنا پڑتی ہے۔ جنگ عظیم اول اور دوم میں کچھ ایسی کیفیات دیکھنے کو ملی ہیں۔ جو مختلف ممالک کے فوجیوں میں بکثرت پائی گئی۔ جوزف بنکس رقمطراز ہیں:

> "By 1850's nostalgia was lossing its status as a particular disease and coming to be seen rather in 1st and 2nd world war still being recognized"(۱۴)

ناسٹلجیا کی اصطلاح سب قبل سوئس ماہر طب یونس ہافر نے ۱۶۸۸ء میں متعارف کروائی۔ یہ اصطلاح انہوں نے "وطن کی خواہش یا واپسی" کے معنوں میں استعمال کی۔ یونس ہافر رقمطراز ہیں۔

> "Greek in origin and indeed composed of two sounds, the one of which is nosos, return to the native land; the other, Algos, signifies suffering or grief; so that thus far it is possible from the force of the sound Nostalgia to define the sad mood originating from the desire for the return to one's native land."(۱۵)

iii۔ یادماضی:

سر جھٹکنے سے کچھ نہیں ہو گا

میں ترے حافظے میں رہ گیا ہوں (۱۶)

ہر ڈھلتا لمحہ ماضی میں تبدیل ہو کر یادداشت کا حصہ بن جاتا ہے جبکہ یاداشت ذات کے بکھرے ہوئے اجزاء کو مجسم کر کے تہذیبی تشخص قائم کرتی ہے۔ ماضی خوشگوار اور ناخوشگوار یادوں کا مرقع ہے۔ عموماً ماضی میں جھانکنا ایک تکلیف دہ عمل ہوتا ہے۔ لیکن اس سے پیچھا بھی نہیں چھڑایا جا سکتا۔ یہ تا دیر سائے کی طرح پیچھا کرتا ہے۔

یاد ماضی عذاب ہے یارب

چھین لے مجھ سے حافظہ میرا (۱۷)

ناخوشگوار یادوں پر اختر انصاری نے بھی حافظہ کے چھین جانے کی دعا کی تھی لیکن ناخوشگوار یادوں کے ساتھ ساتھ فرد کا ماضی خوشگوار یادوں پر بھی مشتمل ہوتا ہے۔ جن کی یاد فرد میں ایک نئی زندگی جینے کی امید بھر دیتی

ہے۔انسان ان لمحات کو دوبارہ جینے کی تمنا کرتا ہے۔یہ تمنا اس قدر زورآور ہوتی ہے کہ فرد ناسٹلجیا کا شکار ہو جاتا ہے۔ عموماً فرد اس کیفیت سے اس وقت دوچار ہوتا ہے جب حال سے بیزار ہو چکا ہو۔

قاضی جاوید راقمطراز ہیں:

> ''بہت سے دوسرے خیالات اور احساسات کی طرح ناسٹلجیا کا احساس بھی ہماری سماجی زندگی کو متاثر کرتا ہے۔وہ ہمیں ماضی کے لمحوں اور مقامات میں سے ایسے اجزاء تلاش کرنے پر آمادہ کرتا ہے جو ہماری موجودہ صورتحال کی ناگواری کا مداوا کر سکے۔''(۱۸)

عموماً حال سے فراریت کا رجحان ڈسٹوپیا ریاست کے افراد کے اندر کثرت کے ساتھ پایا جاتا ہے ڈسٹوپیا ریاست کا تقریباً ہر فرد ناسٹلجی کہلاتا ہے۔وہ حال کے مقابلے ماضی کے سماجی نظام کو بہتر قرار دیتے ہیں۔وہ ایسا نظام دوبارہ دیکھنے کے خواہاں ہوتے ہیں۔لیکن اگر عالمی منظرنامے کا غائر مشاہدہ کیا جائے تو یہ آشکار ہوتا ہے کہ ترقی یافتہ ممالک جہاں فرد کو دنیاوجہاں کی آسائش میسر ہوتی ہے وہاں بھی فرد ناسٹلجیا کا شکار دکھائی دیتا ہے۔جس کے بہت سے محرکات ہیں جس پر دریں اثناء پیراگراف میں گفتگو کی جائے گی۔ناسٹلجیا کا مذکورہ رجحان تارکین وطن میں کثرت سے پایا جاتا ہے۔

۲۔ناسٹلجیا کے سماجی کردار کی نوعیت: کلے روٹلیج کے تصورات کی روشنی میں:

انسان معاشرتی حیوان ہے۔جو تادم مرگ دوسروں پر انحصار کرتا ہے۔جیسے کہ بچے کو بچپن سے لے کر بالغ ہونے تک زندہ رہنے کے لیے والدین کی طرف سے دیکھ بھال کی اشد ضرورت رہتی ہے۔جسمانی طور پر خود مختار ہونے کے بعد بھی وہ دوسروں کی رہنمائی سے مستفید ہوتا رہتا ہے۔جب لوگ مشترکہ مقاصد کے حصول کے لیے ٹیم یا گروپ کی صورت میں باہمی تعاون سے کوئی امر سرانجام دیتے ہیں تو مثبت اور بہترین نتائج سامنے آتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ انسان نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو اجتماعی طور پر بروئے کار لاتے ہوئے جزوی طور پر کرۂ ارض پر غلبہ حاصل کیا ہے۔

انسان اپنی زندگی میں جو کچھ کرتا ہے اس کی وجہ سماجی تعلقات کو تلاش کرنے اور اسے برقرار رکھنے کی شدید خواہش ہے۔ناسٹلجیا بھی سماجی تعلقات کو تلاش کرنے اور برقرار رکھنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔پرانی

یادوں میں بہت زیادہ سماجی مواد موجود ہوتا ہے۔ جس سے سماجی تعلقات کو مزید بہتر بنایا جاسکتا ہے۔ عموماً اس کا شکار بھی وہی لوگ ہوتے ہیں جو سماجی تعلقات کو اہمیت دیتے ہیں۔

> "People who prioritize or are especially motivated by belongingness needs are nostalgia prone."(۱۹)

ناسٹلجیا سے انفرادی اور اجتماعی طور فوائد حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ ان فوائد میں زندگی کی معنویت، خود تسلسل، رجائیت پسندی، تحریک، جسمانی قربت، مضبوط رشتہ کے اہداف، ہمدردی میں اضافہ، مدد کی تلاش اور اعلی سماجی رویہ شامل ہیں۔ پرانی یادیں سماجی روابط کو مضبوط بناتی ہیں۔ یہ سماجی اہداف کو متحرک کرتی ہیں اور افراد کو سماجی روابط کو آگے بڑھانے اور باہمی مسائل پر قابو پانے کی ترغیب دیتی ہیں۔

کلے روٹلیج ناسٹلجیا اور تجرباتی نفسیات کے ماہر ہیں۔ انہوں نے اسی سے زائد سائنسی مقالے شائع کیے ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب میں ناسٹلجیا کے سماجی کردار کی نوعیت پر حاصل خواہ گفتگو کی ہے۔ "Nostalgia a psychological resource" جو تجرباتی طریقہ کار پر مشتمل ہے۔ کلے روٹلیج کے نزدیک پرانی یادوں کے چند ایسے عمومی محرکات دکھائی دیتے ہیں جو لوگوں کو حال سے بیزار کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ سماج سے کٹ جاتے ہیں۔ ان میں نفسیاتی طور پر دھمکی آمیز لہجے، تنہائی، خود سے الگ تھلک رہنا اور سماجی ضروریات پوری نہ ہونا شامل ہیں۔

> "People turn to nostalgia in response to affectively negative or psychologically threatening experiences. Specifically, research has identified negative affect, loneliness, meaninglessness, and self-discontinuity as states that increase nostalgia"(۲۰)
>
> "People turn to nostalgia when their social needs are not being met"(۲۱)

ناسٹلجیا کے سماجی تعلق کو جانچنے کے لیے کلے روٹلیج نے مختلف شرکاء پر مختلف نوعیت کے تجربات کیے ہیں۔ جن میں سے چند ایک کو بیان کر کہ مجوزہ تحقیق میں سماجی کردار کی نوعیت کو پرکھا جائے گا۔ پہلے تجربے میں

پرانی یادوں کے سماجی فعل کی جانچ کرنے کے لیے شرکاء کو دو گروہوں میں تقسیم کیا گیا۔ان میں سے ایک گرو ناسٹلجیائی جبکہ دوسرا گرو غیر ناسٹلجیائی تھا۔ان دونوں گروہوں کے شرکاء کو ماضی کے کسی خاص تجربے یا ماضی بعید کے کسی عام تجربے کے بارے میں مختصر لکھنے کے لیے ہدایات دی گئی جس کے ذریعے ان شرکاء کو پرانی یادوں سے جوڑا گیا۔شرکاء نے سماجی رابطے سے متعلق جواب دیا۔اس تجربے نے اس بات کی تائید کی کہ پرانی یادوں سے تعلق کی ضروریات کو پورا کرنے میں مدد ملتی ہے۔ناسٹلجیائی گرو کے شرکاء نے غیر ناسٹلجیائی شرکاء کے مقابلے میں زیادہ سماجی طور پر جڑے ہونے کی اطلاع فراہم کی۔

دوسرے تجربے میں پرانی یادوں یا حالیہ واقعات کے حالات کے بعد باہمی تعلقات کا ایک پیمانہ دیا گیا۔قریبی تعلقات کے پیمانے پر نظر ثانی شدہ تجربہ اس حد تک اندازہ لگاتا ہے کہ لوگ اپنے آپ کو محبت اور تعاون کے قابل کس حد تک سمجھتے ہیں۔(قریبی تعلق سے متعلق اضطراب)جیسا کہ مجھے فکر ہے کہ رومانوی ساتھی میری اتنی پروا نہیں کرے گا جتنی میں ان کی کرتا ہوں۔دوسروں کو ان کی تکلیف کے لیے جواب دہ سمجھیں۔(تعلقات سے متعلق اجتناب)رومانوی ساتھی کے قریب ہونے سے بے چینی بڑھتی ہے۔اگرچہ یہ دونوں جہتیں وقت کے ساتھ ساتھ بڑی حد تک مستحکم ہوتی ہیں۔کیوں کہ یہ بنیادی تعلقات کے منصوبوں کی نمائندگی کرتی ہیں۔ناسٹلجیا کم از کم وقتی طور پر سماجی تعلقات کے بارے میں لوگوں کے رویوں کو متاثر کر سکتا ہے۔اگر ناسٹلجیائی یادوں میں باہمی کامیابی شامل ہے تو ان پر نظر ثانی کرنے سے تعلقات کے بارے میں لوگوں کے منصوبوں پر اثرانداز ہوا جا سکتا ہے۔ناسٹلجیائی یادوں میں شامل لوگوں نے غیر ناسٹلجیائی لوگوں کے مقابلے میں تعلقات سے متعلق گریز اور اضطراب کی کم سطح کی اطلاع دی ہے۔

تیسرے تجربے میں ناسٹلجیا کی صلاحیت باہمی قابلیت کے جذبات کو مثبت طور پر متاثر کرتی ہے۔چونکہ پرانی یادوں میں باہمی کامیابی کے تجربات شامل ہوتے ہیں۔کیا ان چیزوں پر غور کرنے سے لوگوں کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ باہمی طور قابل ہیں؟ایسے نقطوں پر غور کرنے کے لیے کلے روٹلیج نے پرانی یادیں یا پہلے کی طرح ایک عام سوانح عمری کی یادداشت کی حوصلہ افزائی کی اور سماجی تعلقات کو شروع کرنے میں سمجھی جانے والی قابلیت کا اندازہ لگانے کے لیے ابتدائی انکشاف اور جذباتی معاونت کے ذیلی جذبات کا انتظام کیا۔جہاں آپ نئے تعلقات شروع کرنے کے لیے لوگوں کو اچھی طرح سے نہیں جانتے۔وہاں ذاتی معاملات کا خود انکشاف کرنا۔مثلاً کسی قریبی ساتھی کو بتانا کہ آپ اس کی کتنی قدر کرتے ہیں اور دوسروں کی جذباتی مدد کرنا۔ان تجربات سے ثابت ہوا کہ پرانی یادیں

سمجھی جانے والی باہمی قابلیت کو متاثر کرتی ہیں۔ناسٹلجیائی شرکاء نے تینوں حالتوں پر غیر ناسٹلجیائی شرکاء کے مقابلے میں زیادہ پوائنٹس حاصل کیے۔

چوتھے تجربے میں پرانی یادوں کے تعلق کے جذبات کی تصدیق کی گئی ہے۔اس تجربے میں چین سے تعلق رکھنے والے انڈرگریجویٹ طلباء نے پرانی یادوں یا عام سوانح عمری کے تجربے کو ذہن میں لاتے ہوئے سماجی حمایت کے پیمانے کو مکمل کیا۔مثلاً جب چیزیں غلط ہو جاتی ہیں تو دوستوں پر اعتماد کرسکتے ہیں؟شرکاء کو یہ کہا گیا کہ ان کے خیال میں کتنے دوست رضاکارانہ طور پر کسی مطالعہ میں حصہ لیں گے؟ناسٹلجیائی شرکاء نے غیر ناسٹلجیائی شرکاء کے مقابلے میں سماجی مدد کے بارے میں زیادہ تاثرات کی اطلاع فراہم کی۔اس کے علاوہ ناسٹلجیائی شرکاء نے زیادہ تعداد میں دوستوں کو درج کروایا۔کہ وہ غیر ناسٹلجیائی کے مقابلے میں اضافی کریڈٹ حاصل کرنے میں ان کی مدد کرنے کے لیے تیار ہیں۔کلے روٹلیج نے ان نتائج کو ایک الگ ثقافتی تناظر میں بھی پرکھا اور اس بات کی تصدیق کی ہے کہ ناسٹلجیا لوگوں کی ضروریات کو پورا کرنے میں مدد فراہم کرتا ہے۔

پانچواں تجربے میں تحقیق میں پرانی یادوں کے الگ الگ اشاروں کو استعمال کرتے ہوئے ناسٹلجیا کے سماجی فعل کو مزید واضع کیا گیا ہے۔ایک مانوس بو جو ان کو عہدِ طفلی یا جوانی کی یاد دلاتی ہے لیکن کیا پرانی خوشبو سے پیدا ہونے والی پرانی یادیں نفسیاتی کام کرتی ہیں؟اور سب سے زیادہ متعلقہ ،کیا یہ سماجی تعلق کے جذبات کو بڑھاتی ہیں؟اس لیے شرکاء میں ٹیوبیوں پیش کی گئی جس میں پائلٹ سٹڈی سے منتخب تیل شامل تھے اور شرکاء کو ہدایت کی گئی کہ وہ ہر تیل کو سونگھیں اور اس بات کی نشاندہی کریں کہ اس خوشبو نے شرکاء کو کس قدر پرانی یادوں کا احساس دلایا؟اور مکمل اقدامات جس میں سماجی روابط کا اندازہ کرنے والی دو چیزیں شامل ہیں (پیاروں سے منسلک اور پیار)۔خوشبو سے پیدا ہونے والی پرانی یادوں کی اعلی سطحیں اعلی سماجی رابطے سے وابسطہ تھیں۔

موسیقی اور شاعری پرانی یادوں کا ایک محرک ہے۔جو لوگ اپنی جوانی کے گیت سنتے ہیں تو وہ پرانی یادوں کے جذبات کو فروغ دیتے ہیں۔اکثر لوگ جان بوجھ کر ایسے گیت اور غزلیں سنتے اور پڑھتے ہیں جو ان کو پرانی یادوں کے ساتھ جوڑتی ہیں۔ایک تجربے میں شرکاء کو پرانے گیتوں کی ایک فہرست فراہم کی گئی۔جو ان کو پرانی یادوں میں مبتلا کر دے۔محققین نے پیمائش کے لیے ایک پیمانے کا انتظام کیا جس میں شرکاء سے کہا گیا کہ وہ اس بات کی نشاندہی کریں کہ ان گیتوں نے انہیں کس حد تک سماجی طور پر جڑے ہوئے محسوس کروایا جیسے کہ پیاروں سے جڑا ہوا ہونا۔نتائج سے پتا چلا کہ پرانی یادوں کی موسیقی دوسروں سے سماجی تعلق کے جذبات کو فروغ دیتی ہے۔

جیسے کہ مذکورہ بالا پیرا گراف میں تجربات کی روشنی میں بحث کی گئی ہے کہ پرانی یادیں تعلق کے تصورات میں مثبت کردار ادا کرتی ہیں۔ اگرچہ سماجی تعلق کے تصورات رکھنے کے واضح طور پر فوائد ہیں۔ لوگوں پر انحصار کرنا سماجی ضروریات کو پورا کرنے کا بالواسطہ عارضی حل ہے۔ لوگ بالا آخر حقیقی تعلقات کو تلاش کرنے اور برقرار رکھنے سے سب سے زیادہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ لوگوں کو ایک وسیع تر سماجی تانے بانے کا حصہ بننے کی ضرورت ہے۔ کلے روٹلیج کے مطابق اس مباحث سے مختلف سوالات ذہن میں ابھرتے ہیں۔ پرانی یادیں سماجی محرکات اور رویے پر کیسے اثر انداز ہوتی ہیں؟ کیا پرانی یادیں ایک ایسا تجربہ ہے جو لوگوں کو محض پیار اور حمایت کا احساس دلاتا ہے؟ یا یہ کوئی ایسا تجربہ ہے جو لوگوں کو سماجی کوششوں کی طرف رغب کرتا ہے۔ ان سوالات کا جواب دیتے ہوئے کلے روٹلیج رقمطراز ہیں:

> "According to Clay Routledge a number of studies have now considered various ways that nostalgia can influence social motivation, goals, pro-social behavior, and intergroup attitudes."(۲۲)

مذکورہ بالا اقتباس اور مباحث کی روشنی میں سماجی محرک پر پرانی یادوں کا اثر محض جذباتیت سے بہت آگے نکل جاتا ہے۔ اگرچہ اسے اکثر حال سے فرار حاصل کرنے کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ روٹلیج کے تصورات کی روشنی میں پتا چلتا ہے کہ ناسٹلجیا سماجی مصروفیات کو فعال طور پر آگے بڑھا سکتا ہے۔ اپنائیت کے جذبات کو فروغ دینے اور اپنی سماجی صلاحیتوں میں اعتماد بڑھانے سے، ناسٹلجیا افراد کو نئے تعلقات تلاش کرنے میں حوصلہ افزائی اور موجودہ روابط میں پیدا ہونے والے مسائل پر قابو پانے کی ترغیب دیتا ہے۔ جو سماجی رویے کے لیے ایک محرک کے طور پر کام کرتا ہے۔ سماجی تعلق اور ہمدردی کے جذبات کو پیدا کرنے سے، یہ دوسروں کی مدد کرنے لیے افراد کی خواہش کو نمایاں طور پر بڑھا سکتا ہے۔ کلے روٹلیج کے تصورات کے مطابق ناسٹلجیا کے تجربات وقت اور پیسے دونوں لحاظ سے زیادہ خیرات دینے کا بحث بنتے ہیں۔ ناسٹلجیا اور بڑھتی ہوئی ہمدردی کے درمیان مشاہدہ شدہ ربط سے بلند سماجی حامی جھکاؤ کو مزید تقویت ملتی ہے۔ اس کے علاوہ خیراتی درخواستوں میں ناسٹلجیا کے عناصر کو حکمت عملی کے ساتھ شامل کرنے سے عطیات کو موثر طریقے سے بڑھایا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ مشترکہ انسانیت اور تعلق کے احساس کو پروان چڑھانے سے ناسٹلجیا بد نما گروہوں کے تئیں تعصب کو کم کر سکتا ہے۔ مزید پسماندہ گروہوں کے ارکاکین کے ساتھ ماضی کے مثبت تعاملات پر غور کرنا، ہمدردی، اعتماد اور شمولیت کو بھی بڑھا سکتا ہے۔ اس میکانیزم میں سماجی

رابطے کے بڑھتے ہوئے جذبات، گروہوں کی بے چینی میں کمی اور مشترکہ شناخت کا زیادہ احساس شامل ہے۔ مختصر کلے روٹلیج کے تصورات کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ناسٹلجیا ایک ہمدرد معاشرے کو فروغ دینے میں ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔

i۔اردو شاعری اور ناسٹلجیا:

شاعری جذبات واحساسات کا مجموعہ ہوتی ہے۔جن کا تعلق انسان کے داخل سے ہوتا ہے۔داخلی سطح پر ہونے والی محسوسات کو قوت گویائی سے موزوں بنایا جاتا ہے۔انسان اور حیوان میں قوت گوئی کا فرق ہوتا ہے۔حیواں جذبے کا اظہار اپنی حرکات وسکنات سے کرتے ہیں جبکہ انسان اپنے جذبے کا اظہار قوت گویائی سے کرتا ہے۔شاعری کا مادہ "شعر" سے مشتق ہے۔جس کے معنی کسی چیز کے بارے جاننے یا واقفیت حاصل کرنے کے ہیں۔لیکن شعری اصطلاح میں شعر ایسے کلامِ موزوں کو کہتے ہیں جو قصد باندھ کر کیا جائے۔کلام موزوں جذبات و احساسات کے تابع ہوتا ہے۔شعر میں کسی مخصوص واقعے کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔شاعر اسی معاشرے کا فرد ہوتا ہے۔اس نسبت سے وہ براہ راست معاشرے اور ماحول سے نہ صرف مطابقت رکھتا ہے بلکہ اس کے اثرات بھی قبول کرتا ہے۔

دنیا کی تمام زبانوں میں شاعری کی حقیقت مسلمہ ہے۔دیگر زبانوں کی طرح اردو زبان نے شاعری کے میدان میں روزاول سے اپنی الگ تھلگ پہچان بنائی ہے۔جتنی کم مدت میں اس نے اردو زبان و ادب کو دنیا کی بڑی زبانوں کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔وہ قابل ستائش ہے۔اردو شاعری اپنے اندر ہندوستانی تہذیب وثقافت، سیاسی و سماجی حالات وواقعات اور مختلف رجحانات ومیلانات اور تحریکات کو سموئے ہوئے ہے۔ان رجحانات میں ایک رجحان ناسٹلجیا کا ہے جس رجحان کو سمجھنے کے لیے اردو شاعری کے آغاز وارتقاء اور مختلف ادوار کے سیاسی وادبی منظر نامے کا اجمالی جائزہ ضروری ہے جس سے یہ دیکھنے میں مدد ملے گی کہ اردو شاعری میں یہ رجحان پہلے سے کیا موجود تھا یا نہیں؟اور اگر موجود تھا تو اس کے کون کون سے عناصر موجود تھے؟

اردو شاعری کے آغاز کے تانے بانے شمالی ہند سے قبل دکن سے جاملتے ہیں۔اردو ادب کی ترقی وترویج میں بادشاہوں نے اپنی بساط کے مطابق حصہ ڈالا ہے۔سرزمین دکن اور گجرات کے نظم ونسق کو چلانے کے لیے اسے

مختلف حصوں منقسیم کیا گیااور ترک سرداروں کو امیر صدہ مقرر کیا۔جو اپنے کنبوں کے ہمراہ یہاں آباد ہوئے۔جہنوں نے یہاں کی مقامی زبان پر اپنی تہذیب وثقافت کے اثرات مرتب کیے۔ خلجی سلطنت کے زوال کے بعد سلطان محمد تغلق نے ریاست کو مستحکم بنانے کے لیے ۱۳۲۸ء میں دارالحکومت دولت آباد کارخ کیا۔ عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ امراء جس خطے کارخ کرتے ہیں اہل ہنر و دانش بھی جوق در جوق اس سمت کھینچے چلے جاتے ہیں۔وہاں کی تہذیب وثقافت، معاشرت اور علم و ادب، ترقی کی منازل طے کرتے ہیں۔دولت آباد میں ہجرت کے بعد دکن کی تہذیب وثقافت اور زبان پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔

تغلقوں کے زوال کے بعد ۱۳۴۸ء میں امیر علاؤالدین نے بہمنی سلطنت کی بنیاد رکھی۔دکن کی سلطنتوں میں مختلف زبانیں بولی جاتی تھی۔رابطے کے لیے ایسی زبان کی ضرورت محسوس کی گئی جو نہ صرف ان میں باہمی اتحاد پیدا کر سکے بلکہ کاروبار زندگی میں معاون ثابت ہو سکے۔اس خلا کو شمالی ہند کی زبانوں نے پُر کیا جن کے ملاپ سے دکنی اردو کی بنیاد ڈالی گئی۔

بہمنی سلطنت جب کمزور پڑنے لگی تو مختلف صوبوں نے خود مختاری کا اعلان کر دیا۔اس دوران بیجاپور کے حاکم عادل شاہ نے ۱۴۹۰ میں سلطنت کی بھاگ دوڑ سنبھالی اور ایک خود مختار ریاست کی بنیاد ڈالی۔یہی سے عادل شاہی سلطنت کی بنیاد پڑی۔یوسف عادل شاہ علم وادب کے دلدادہ تھے۔انکی طبعیت موزوں تھی وہ خود شعر کہتے تھے اور شعراء کی حوصلہ افزائی بھی کرتے تھے۔اپنے دور حکومت میں انہوں نے دور دراز سے علم و فن کے ماہر اساتذہ کو بیجاپور آنے کی دعوت دی۔یوں شعر و ادب کے لیے بیجاپور کی سرزمیں سازگار ثابت ہوئی۔عادل شاہی دور میں اردو زبان سرکاری اور دفتری معاملات میں رائج رہی ۔اس دور کے اہم شعراء میں ابراہیم عادل شاہ، عبدل، عاجز، ایاغی، ابوالحسن، اشرف بیانی، برہان الدین جانم، رستمی، سید میراں ہاشمی، حسن شوقی اور نصرتی شامل ہیں۔

بہمنی سلطنت کا شیرازہ بکھرنے کے بعد سلطان قلی نے گوالکنڈہ میں قطب شاہی سلطنت قائم کی۔قطب شاہی سلطنت کے فرمانرواخود بھی شاعر تھے اور علم و فن کے قدردان بھی تھے۔بیجاپور کے بعد دوسرابڑا علم وادب کا مرکز گوالکنڈہ بنا۔اس دور میں بھی ارباب علم و فن نے گوالکنڈہ کی راہ لی۔قطب شاہی کے پانچواں فرمانروا سلطان قلی قطب شاہ اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر تھے۔اس دور کے اہم شعراء میں ملاخیالی، ملاوجہی، غواصی، فیروز محمود، ابن نشاطی، طبعی، میراں جی اور عبداللہ قطب شاہ کے نام اہم ہیں۔

طبعی کا شمار حید آباد کے سب سے بڑے استاد شاعر میں ہوتا تھا۔ ان کی وجہ شہرت مثنوی "بہر و گل اندام" ہے۔ طبعی نے اپنے عہد کے حالات وواقعات کو شعر میں موزوں کیا ہے۔ بالخصوص ان کی شاعری میں اپنے شہر سے محبت نمایاں نظر آتی ہے۔

جلبوئی یاد کرتا نہیں اپنا وطن

او مرد اہے پیرن ہے اصل کا کفن (۲۳)

بہمنی اور قطب شاہی سلطنتوں میں نہ صرف شعر وادب نے بلکہ تہذیب و معاشرت نے قابل قدر ترقی کی۔ اس دور میں مثنوی، قصیدہ، رباعی، اور غزل میں قابل قدر کام کیا گیا۔ بہمنی اور عادل شاہی دور کے بعد اورنگزیب عالمگیر نے 1484 میں دکن اور بیجاپور کو مغل سلطنت میں شامل کیا۔ اس دور کے شعراء ہجرت کے تجربات سے گزرے۔ انہوں نے شاعری میں اس تجربے کو موضوع بنایا۔ اس دور کے اہم موضوعات میں حب الوطنی اور یاد ماضی نمایاں تھے۔ اس دور کے اہم شعراء میں سراج اورنگ آبادی، اشرف اور ولی اہم تھے۔

ولی دکنی اس عہد کی ایک توانا آواز تھی ۔ولی دکنی کی شاعری نے ہی بعد ازاں شمالی ہند کی شاعری کو متاثر کیا۔ اس دور کے شعراء میں سے ولی کی شاعری میں ہجرت کے تجربے میں ناسٹلجیا شدت کے ساتھ محسوس کیا جاسکتا ہے وہ "قطعہ در فراق گجرات" میں اپنے وطن کو یاد کرتے ہیں۔ جس کے فراق میں وہ بے تاب ہیں۔ انہیں دوستوں، رشتہ داروں کی یادیں بے قرار رکھتی ہیں۔ ان کا دل پارہ پارہ ہو چکا ہے۔ ان کے نزدیک ان کے زخم پر مرہم رکھنے کے لیے کوئی خطہ گجرات کا متبادل نہیں ہو سکتا۔ ان کے قطعہ میں وطن واپس پلٹنے کی خواہش سر اٹھاتے ہوئے دیکھی جاسکتی ہے۔

گجرات کے فراق سوں ہے خار خار دل

بے تاب ہے سینے میں آتش بہار دل

مرہم نہیں ہے اس کے زخم کا جہاں میں

شمشیر ہجر سوں جو ہوا ہے فگار دل

حاصل کیا ہوں جگ میں سراپا شکستگی

دیکھا ہے ہجہ شکیب سوں صبح بہار دل

ہجرت سوں دوستاں کے ہوا جی مرا گداز

عشرت کے پیرہن کوں کیا کیا تار تار دل

ہر آشنا کی یاد میں گرمی سوں تن من

ہر دم میں بے قرار ہے مثل شرار دل

افسوس ہے تمام کو آخر کو دوستاں

اس مے کدے سوں اٹھ کے چلا صد بار دل

لیکن ہزار شکر ولی حق کے فیض سوں

پھر اس کے دیکھنے کا ہے امیدوار دل (۲۴)

اپنے آبائی وطن سے دوری ان کو رہ رہ کر ستاتی ہے۔ ایسا وطن کہ جہاں ان کی خوشگوار یادیں ہیں۔ ان کے ہاں فراق گجرات ایک ایسے دکھ کی کایا بدل لیتا ہے جس کے پھندے سے جان چھڑانا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے وہ مسیحاؤں سے کسی قسم کی بحث و تکرار نہیں کرنا چاہتے۔

جدائی کے پھنسا ہوں دام میں لولو مرے شہر کوں

کہ مجھ اس دکھ کے پھاندے سوں چھڑائے نئیں سو کیا باعث (۲۵)

اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد شہزادہ معظم کی تاج پوشی ہوئی۔ معظم کے بعد تاج پوشی اور تحت پر شب خون مارنے کا ایک سلسلہ چل نکلا۔ اس دور کی صورت حال کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ معظم کے مرنے کے بعد اس کے بیٹوں نے باپ کو لاش کو دفنائے بغیر ایک ماہ تک تحت حاصل کرنے کے لیے آپس میں جنگ جاری رکھی۔ اس جنگ کا نتیجہ یہ نکلا کہ جہاں دار تحت پر متمکن ہوا۔ وہ شراب نوشی کا عادی تھا اور اس کی شخصیت میں بھی مغلیہ شاہانہ وقار موجود نہ تھا۔ اس دور میں اخلاقی قدریں بے وقعت ہو کر رہ گئی۔ جہاں دار کے قتل کے بعد سادات بارہہ کی مدد سے فرخ سیر نے تحت کو سنبھالا۔ وہ انتظامی امور میں خاص دلچسپی نہ لیتا تھا۔ اس کا دور حکومت امراء کی ہاتھوں کٹھ پتلی کا کردار نبھا رہا تھا۔ سید بردان کے خلاف سازش کے نتیجے میں اندھا کر کے قتل کر دیا گیا۔

جمیل جالبی راقمطراز ہیں:

"تقریباً تیس سال کے عرصے میں ،سارے براعظم میں پھیلی ہوئی مغلیہ سلطنت، بکھر گئی، اسی لیے اسے "خاتم السلاطین بابریہ" کہا جاتا ہے۔"(۲۶)

محمد شاہ رنگیلا کے عہد میں امراء اقتدار کی سازشوں میں لگ گئے جس نے بیرونی قوتوں کو رستا فراہم کیا۔ سعادت خان نے نادر شاہ کو دہلی میں قدم رکھنے کی دعوت دی۔ نادر شاہ نے جب دہلی پر چڑھائی کیں تو ایک اندازے کے مطابق ایک لاکھ بیس ہزار عورتوں، بچوں، نوجوانوں اور بوڑھوں کو لقمہ اجل بنایا گیا۔ احمد شاہ کی وفات سے قبل بچی کچی کسر احمد شاہ ابدالی نے نکال دی۔ جس نے پنجاب، کشمیر اور ملتان پر قبضہ کیا۔ دریں اثناء محل کے اندر سازشوں، غداریوں، خود غرضیوں اور امراء کی ریشہ دوانیں عروج پر تھی۔ ادھر مرہٹے، جاٹ، سکھ، روہیلوں نے سلطنت کو کمزور کیا۔ پانی پت کی جنگ کے بعد شاہ عالم کو احمد شاہ ابدالی نے بادشاہ مانا لیکن تب تک مغلیہ سلطنت سوائے قلعہ کے کہیں قائم دائم نہ رہی۔

ڈاکٹر تارچند رقمطراز ہیں:

"کہ اٹھارویں صدی کے نصف آخر کا براعظم ایک جنگل معلوم ہوتا ہے جس میں خوفناک انسانی درندے بستے ہیں، جن میں جانوروں کی سی خود غرضی اور قوت حاصل کرنے کا حیوانی جذبہ ہے، جن میں نہ اخلاقی قدریں ہیں اور نہ دوراندیشی۔ جن کے لیے فریب، دھوکا سازشیں وقتی مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ سارا معاشرہ بے جہت و بے مقصد ہے جس کے سامنے کوئی ایسی منزل نہیں ہے جس سے فرد اور معاشرے کی زندگی میں معنویت پیدا ہوتی ہے۔"(۲۷)

اس دور میں اردو شاعری میں بڑے بڑے نام نظر آتے ہیں۔ جن میں میر تقی میر، مرزا محمد رفیع سودا، خواجہ میر درد، ابراہیم ذوق، ابراہیم ذوق، مرزا اسد اللہ خان غالب اور مومن کا نام قابل ذکر ہے۔ اس دور میں دہلی کے موضوعات میں حزن وملال، دنیا کی بے ثباتی، ہجرت کا کرب، حب الوطنی وغیرہ اہم ہیں۔ لکھنوء اور فیض و آباد میں ہجرت کے بعد ان شعراء کی شاعری میں مراجعت کی خواہش بھی شدت کے ساتھ محسوس کی جاسکتی ہے۔ اس عہد کو اگر میر وسودا کا دور کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ اردو ادب میں اس عہد کو اردو کا عہد زریں کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ان شعراء میں سودا کی شناخت صنف قصیدہ تھا۔ دہلی میں جب حالات خراب ہوئے تو سودا نے پہلے فرخ آباد اور پھر شجاع الدولہ کے زمانے میں فیض آباد کو اپنا مسکن بنایا۔ سودا مختلف درباروں سے وابسطہ رہے۔ معاشی تنگ دستی اور دہلی کے نامساعد حالات سے تنگ آکر سودا نے بارہا ہجرتیں کیں۔ ہجرت کے تجربات

نے ان کی شاعری میں اپنے آبائی وطن سے بے لوث محبت، اس کی یاد اور وہاں پر گزرے خوشگوار لمحات کو اپنے اندر سمویا ہے۔ یہ یادیں ان کو دیارِ غیر میں شدت سے تنہائی کا احساس دلاتی ہے۔

نہال اسا نہیں ہے خرمی ماٹی میں غربت کے

وطن سے مشت خاک اے قدم پر باندھ کے لے جا(۲۸)

بلبل کو کیا تڑپتے میں دیکھا چمن سے دور

یارب نہ کیجیو تو کسی کو وطن سے دور (۲۹)

مرتا ہوں اس دکھ سے، یاد آتی ہیں وہ باتیں

کیا دن وہ مبارک تھے، کیا خوب تھیں وہ راتیں(۳۰)

۱۷۲۲ء میں نواب سعادت علی خان کو اودھ کا صوبیدار مقرر کیا گیا۔ نواب نڈر اور بیباک تھے۔ ان کا تقرر سے قبل لکھنو پر شیوخ بر سر اقتدار تھے۔ نواب محمد نواب فرخ آباد کی مدبرانہ سوچ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک دعوت میں سات ہزار شیوخ زادوں کو ٹھکانے لگایا گیا۔ اور دریائے گھاگرا کے کنارے ایک چھوٹی سی بستی بسائی گئی جو بعد میں فیض آباد کے نام سے موسوم ہوئی۔ مرکز کے کمزور ہوتے ہی نواب نے خود مختار ریاست کی بنیاد رکھی۔ صفدر جنگ اور شجاع الدوالہ کے زمانے میں لکھنو آباد ہوا۔ انہوں نے لکھنو اور فیض آباد کی خوشحالی کے لیے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ یہ شہر دولت کی فراوانی اور رنگا رنگی سے بھرپور دکھائی دینے لگا۔ فیض بخش رقمطراز ہیں:

> "۔۔۔لباس فاخرہ پہنے شرفائے دہلی کے اعزاء اور رشتہ دار، اطبا، ہر شہر کے گانے بجانے والے قوال بھانڈ اور طوائفیں گلی کوچوں میں نظر آتی تھیں چھوٹے اور بڑے سب کی جیبیں زروجواہر سے بھری تھیں۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی مفلسی اور خلاکت کا گزر نہ تھا۔ نواب وزیر شہر کی آبادی اور رونق کے ایسے خواہاں تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ فیض آباد شاہجہان آباد کی ہمسری کا دعوی کرے گا۔"(۳۱)

دوسری طرف دہلی کے ناساز گار حالات کے پیش نظر اہل کمال پر عرصہ حیات تنگ ہوا تو انہوں نے اودھ، روہیلکنڈ، فرخ آباد، مرشد آباد اور دکن ارکاٹ کی طرف رختِ سفر باندھا۔ ان مہاجرین شعراء میں

میر سراج الدین خاں آرزو نے سب سے پہلے نواب شجاع الدولہ کے ماموں نواب سالار جنگ کی دعوت کو قبول کیا اور لکھنو ہجرت کی۔ جو بعد ازاں لکھنو کے ہی ہو کر رہ گئے۔ ان کے بعد فغاں، سودا، میر، سوز نے ترکِ وطن کر کے لکھنو میں سکونت اختیار کیں۔ ان تارکِ وطن شعراء کی شاعری میں ناسٹلجیائی رحجان شدت کے ساتھ ملتا ہے جس کا ذکر مجوزہ بالا پیرا گراف میں کیا گیا ہے۔ یہ رحجان ان شعراء میں حالات کی بے اعتنائی اور ترکِ وطن کے سبب پیدا ہوا۔ لکھنو کے نمائندہ شعراء میں ناسخ، آتش، جرت، انشاء مصحفی، رنگین، انیس، دبیر، خلیق، ضمیر، رشک، نسیم، صبا، رند، وزیر، تسلیم، ریاض، ثاقب، اور صفی کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان کی نمایاں خصوصیات میں نشاطیہ عنصر ملتا ہے۔ جن میں مضمون آفرینی، معاملہ بندی اور رعایت لفظی وغیرہ شامل ہیں۔

تارکینِ وطن شعراء میں استاد شاعر میر تقی میر بھی شامل تھے۔ اس عہد میں نادر شاہ، احمد شاہ، مرہٹے اور جاٹوں کے حملوں نے دہلی میں رہے سہے سکون کو مزید تباہ کیا تھا۔ تخت آئے دن بدلنے کا کھیل چل رہا تھا۔ نوابوں اور شہزادوں کے سر کاٹنے کی ایک رسم چل نکلی تھی۔ اس عہد میں معاشی آسودگی کے حوالے سے دہلی پسماندگی کا شکار تھا۔ میر ایسے استاد شاعر کو بھی ان حالات میں تلاش روزگار میں شاہجہاں آباد کا سفر کرنا پڑا۔ دہلی کی تباہی و بربادی کے بعد آپ نے اودھ کا رخ کیا۔ ہجرت اور دہلی کے حالات نے میر کو ناسٹلجیائی بنا دیا تھا۔ وہ دہلی کے نامساعد حالات پر نوحہ کنعاں تھے۔ ان کی شاعری میں مہاجرت کے مضمون کے علاوہ رنج والم، اداسی، دہلی کا کرب، ہجرت کی تلخیاں اور دنیا کی بے ثباتی نے جگہ بنائی۔

دلی کی ویرانی کا مذکور ہے
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا[۳۲]

ہم جس زمین پہ آئے واں آسماں بھی تھا
یارب جو کوئی جاوے تو کس طرف جاوے[۳۳]

دن رات گاہ، بے گہ جب دیکھو ہیں سفر میں
ہم کس گھڑی وداعی یارب ہوئے وطن سے[۳۴]

شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا[۳۵]

رفتگاں میں جہاں کے ہم بھی ہیں

ساتھ اس کارواں کے ہم بھی ہیں (۳۶)

لکھنو کی تہذیب و معاشرت کا زوال واجد علی شاہ کے عہد میں ہوا۔ انگریز نے بہادر شاہ کو رنگون اور واجد علی شاہ کو مٹیا برج میں جلاوطن کر کے زندان میں ڈال دیا۔ لکھنو کے حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے شعراء ایک بار پھر ہجرت کے تجربے سے گزرے۔ دہلی اور لکھنو کے بعد شعراء نے رام پور اور حیدرآباد کا رخ کیا۔ اس عہد میں ہجرت کی ایک محرک یہ تھا کہ شعراء اس جگہ کو اپنا مسکن بناتے تھے جہاں دولت کی فراوانی اور قدردانی کی جائے تاکہ وہ پرسکون فضا میں علم وادب کی خدمت میں مشغول رہیں۔ اس حوالے سے رام پور اور حیدرآباد سے پرسکون فضا کہیں اور دکھائی نہیں دی۔ یہ شہر علم وادب کی دلدادہ تھے۔ یہاں کے نواب، نواب یوسف علی خان اور نواب سعادت خان خود بھی شاعر تھے۔ تارکینِ وطن شعراء میں مرزاغالب، ،مظفر علی اسیر اور میر حسین تسکین تھے۔ رام پور کے ساتھ ساتھ شعراء کرام نے حیدرآباد کو اپنا مسکن بنایا۔ حیدرآباد کے حاکم نظام الملک آصف جاہ اول علم دوست تھے۔ وہ خود بیدل کے شاگرد تھے اور فارسی میں ان کے دو دیوان یادگار ہیں۔ یہاں کے شعراء میں داغ دہلوی، امیر مینائی، اختر مینائی، جلیل حسن، مولانا حالی، سرشار قابل ذکر ہیں۔

داغ اس عہد کا معتبر حوالہ ہے۔ ان کی شاعری میں اس عہد کی ترجمانی اور ناسٹلجیائی رجحان نمایاں ہے۔ وہ خوشگوار لمحات کی یاد اور غریب الوطنی کا رونا روتے ہوئے جابجا دیکھے جاسکتے ہیں۔ وہ شاہ نظام کی صحبت میں بھی اپنے آبائی وطن کو یاد کرتے ہیں۔ ان کو غریبی الوطنی میں وطن کی یاد ستاتی ہے۔ وہ ہر لمحے تصور جاناں کیے ہوئے ہیں۔ جو ان کو دیارِ غیر میں بھی تنہا نہیں ہونے دیتا۔ وہ عہدِ موجود میں ہوتے ہوئے بھی عہد ماضی کی خوشگوار یادوں میں سانس لیتے ہیں۔

سب کچھ دیا ہے داغ کو شاہِ نظام نے

آبائی اس کی گرچہ ریاست نہیں رہی (۳۷)

پوچھے کوئی سفر میں گھر سے عدن کی بات

غربت میں یاد آتی ہے کیا کیا وطن کی بات (۳۸)

تلوے فگار دیکھ کے کانٹوں سے بارہا

غربت میں یاد آئے ہیں باغِ وطن کے پھول (۳۹)

پھر اسے کوئی لائے گا کہ نہیں
یہ گیاوقت آئے گا کہ نہیں (۴۰)

تیری یاد ہے یا ہے تیرا تصور
کبھی داغ کو ہم نے تنہا نہ دیکھا (۴۱)

مجموعی طور پر یہ صدی افراتفری کی صدی تھیں۔ جس میں مسلمانوں کے عروج کو زیرک قیادت نہ ملنے کی وجہ سے زوال ہوا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد باقاعدہ برصغیر ملکہ وکٹوریہ کے زیرِ اثر آیا جو ۱۹۴۷ء تک رہا۔ اس دور میں جنگ آزادی کی ناکامی نے مسلمانوں کے وقار کو خاک میں ملایا۔ مسلمانوں کو سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی سطح پر زوال ہوا۔ وہ بدلتے ہوئے حالات میں خود کو نہ ڈھال سکے۔ یوں ان کے لیے حال سے بیگانگی، مستقبل سے آنکھ چرانے اور زبردست ماضی کی یاد میں پناہ لینے کے علاوہ کوئی اور چارہ نہ تھا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی رقمطراز ہیں:

"اٹھارویں صدی میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ فکروذہن ایک جگہ ٹھہر گئے ہیں۔ سارا معاشرہ ماضی کے ضابطوں، اصولوں اور قوانین کو بغیر کسی تبدیلی کے قبول کیے ہوئے ہیں۔ رسم پرستی اس کا مزاج ہے۔ وہ مستقبل کے بجائے ماضی پر تکیہ کیے ہوئے ہے اور یہ ماضی اس کے حال کو متاثر نہیں کرتا۔"(۴۲)

جنگ آزادی کے بعد ۱۸۶۵ء میں لارڈ میکالے نے انجمن مطالب مقیدہ پنجاب (انجمن پنجاب) کی بنیاد رکھی۔ جن کے بانیوں میں مولانا محمد آزاد تھے۔ اس تحریک کا مقصد تھا کہ مشرقی علوم کا احیاء دیسی زبانوں کے ذریعے کیا جائے۔ اس تحریک کے زیرِ اثر جدید اردو شاعری کی بنیاد رکھی گئی۔ لاہور کا دبستان شاعری بھی اسی کی ایک کڑی ہے۔ اس تحریک کے اہم شعراء میں حالی اور آزاد شامل ہیں۔ آزاد نے فراق دلی میں وطن سے محبت کو اپنے مزاج کا حصہ بنایا جبکہ حالی بھی تارکینِ وطن شعراء میں شامل ہیں۔ ان کی مشہور مثنوی "حب الوطن" اس دور کی اہم مثنوی ہے۔ دبستان لاہور کے تارکینِ وطن شعراء میں مرزاراشد گورگانی، میر ناظم حسین ناظم، سبق الحق ادیب، راج نرئن ارمان اور مرزاشرف بیگ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان شعرا کی شاعری میں حب الوطنی، مراجعت کی خواہش، فطرت نگاری اور یادِ ماضی قابل قدر موضوعات ہیں۔ ذیل میں ان شعراء کے کلام کا انتخاب پیش کیا جارہا ہے جس سے اس عہد کی ترجمانی ہوتی ہے۔

اے وطن اے مرے بشت بریں

کیا ہوئے تیرے آسمان و زمیں

رات اور دن کا وہ سماں نہ رہا

وہ زمیں اور وہ آسماں نہ رہا (۴۳)

رہے نصیب کہ اتنا کسی کو رحم آئے

کہ مجھ غریب کو بھی اب وطن میں پہنچائے (۴۴)

وطن عیش دل راحت جان ہے

وہ بہتر ز ملکِ سلیمان ہے (۴۵)

کاش اول ہی اگر عزم سفر کرتا تو

دم بہ دم، دم نہ بجز حبِ وطن بھرتا تو (۴۶)

حب وطن ہے گل چمن روزگار کا

یہ گل سدا دکھاتا ہے موسم بہار کا

حب وطن وہ باغ ہے جس میں خزاں نہیں

گل چیں نہیں ہے جس میں، کوئی باغباں نہیں (۴۷)

درد زباں ہے یہ سخن، جب تک زباں ہے درر سن

حب الوطن، حب الوطن، حب الوطن، حب الوطن (۴۸)

بیسویں صدی کا سورج ابھرنے سے قبل سرسید کی اصلاحی تحریک ثانوی ادبی تحریک بن کر ابھری۔ جس کے روح رواں سرسید احمد خان خود تھے۔ اس تحریک سے وابسطہ لوگوں میں شبلی نغمانی، مولانا الطاف حسین حالی، محمد حسین آزاد، اسمیل میرٹھی اور نذیر احمد تھے۔ اس تحریک نے نہ صرف اصلاح کا بیڑا اٹھایا بلکہ مغربی علوم سے استفادہ بھی کیا۔ جس سے نئی نئی اصناف اردو ادب میں شامل ہوئی اس کے علاوہ اس تحریک نے مسلمانوں کو قدیم رسوم کو ترک کرکے حقائق کا سامنا کرنے کی طرف مائل کیا۔ جس نے قومی سطح پر مسلمانوں کو فعال

بنایا۔ بیسوی صدی کے آغاز میں ہندوستانی عوام سامراج کے نو آبادیاتی نظام کے خلاف جدوجہد اورآزادی کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں۔

بیسویں صدی مختلف رجحانات، تحریکات اور انقلابات کی صدی ہے۔ اس صدی میں علوم کی ترویج، سائنسی ایجادات، ذرائع ابلاغ اور وسائل نقل و حرکت نے نئی تحریکات کے لیے رستہ ہموار کیا۔ اس صدی میں یورپ میں ہونے والی جنگِ عظیم نے انسانی اقدار کو پاش پاش کر دیا۔ علوم وفنون کی ترقی وترویج نے انسانی راسخ عقائد کو پر کاری ضربیں لگائی۔ جس نے انسان کو یہ باور کروایا کہ وہ اکیلا کائنات کا مرکزِ نگاہ نہیں بلکہ وہ تو ایک چھوٹے سے ذرے ،زمیں پر آباد ہے جس کی کوئی وقعت نہیں۔ اس خیال نے اس میں ماحول سے مطابقت کو دھچکا لگایا۔ جس سے قوت متحیلہ کو بروئے کار لانے کی سعی کی گئی۔ جس سے شعراء کی شاعری میں یوٹوپیا خیالات نے جنم لیا۔ سرسید تحریک کے رد عمل کے طور پر رومانوی تحریک نے سر اٹھایا۔ کیوں کہ اس تحریک میں سنجیدگی اور متانت زیادہ تھی اور قوت خیال مفقود تھی۔ اس دور کے ادیبوں میں یہ تحریک خیالی جنت کی متلاشی تھی۔ جو ماحول سے آنکھیں چرا کر ایک نئی دنیا کو کھوجنے کی سعی کر رہی تھی۔ رومانوی نظریات کو فروغ دینے کے لیے "مخزن" کا کردار اہم ہے۔ اس تحریک نے اقبال کو رستہ متعین کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس دور کے اہم شعراء میں جوش، اختر شیرانی، حفیظ جالندھری، ڈاکٹر محمد دین تاثیر، احسان دانش، صدیقی، ساغر نظامی اور افسر میرٹھی کا نام قابل ذکر ہیں۔

بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں ترقی پسند نظریات نے برصغیر میں قدم جمائے۔ اس سے قبل سیاسی اور سماجی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں نے برصغیر کی عوام کے ذہنی اور سماجی انتشار کو تول دیا۔ انقلاب روس نے دنیا بھر کے ادب کو متاثر کیا۔ قدیم رسوم اور مذہبی عقائد پر مادے کو اہمیت دی جانے لگی۔ اور ایک اشتراکی نظام قائم کرنے کی بنیاد رکھی گئی۔ جس کو فروغ دینے کے لیے اختر حسین رائے پوری کا مضمون "ادب اور زندگی" نے اہم کردار ادا کیا۔ اس تحریک نے ہندوستان میں معاشرتی ناانصافیوں کے خلاف آواز بلند کی اور ادیبوں کو سائنسی نقطہ نظر سے متعارف کروایا۔ اور محنت کشی کو ادب کا موضوع بنایا۔ لیکن اس تحریک نے روحانیت کی نفی کی جبکہ انسان کو مادے کے ماتحت کر دیا۔ اس تحریک کے اہم شعراء فیض احمد فیض، علی سردار جعفری، مخدوم اعظمی، معین احسن جذبی، اختر ایمان وغیرہ اہم ہیں۔

چوتھے عشرے میں حلقہ ارباب ذوق کی تحریک فعال تحریک کے طور پر مقبول ہوئی۔ یہ تحریک تو باقاعدہ کسی منشور کے تحت وجود میں نہیں آئی۔ اس تحریک نے تخلیق کو اہمیت دی۔ یہ تحریک فرد کی گمشدہ آواز کو بازیافت

کرنے کی سعی تھی۔ جس نے فرد کو مادے کے بجائے عرفان ذات سے ہمکنار کیا۔ اس تحریک نے قیام پاکستان کے بعد بھی اپنا وجود قائم رکھا۔ جو اب تک جاری ہے۔ اس تحریک کے اہم شعراء میں میر اں جی، ن۔ م۔ راشد، یوسف ظفر، مختار صدیقی، ضیا جالندھری، انجم رومانی اور حفیظ ہوشیار پوری کے نام قابل ذکر ہیں۔

برصغیر کے ادبی ماحول کے ساتھ ساتھ اگر سیاسی منظرنامے پر نگاہ دوڑائی جائے تو مسلم لیگ کا قیام اور کانگرس کا سیاسی رول اہم ہے اس دور میں دو قومی نظریے کو تول دینا، تحریک خلافت اور مسلمانوں کے اتحاد، تقسیم بنگال، نہرو رپورٹ اور مسلم ہندو فسادات نے دو الگ ریاستی ایجنڈے کو بنیادیں فراہم کیں۔ جس کا نتیجہ دو ریاستی حل کے سوا کوئی اور نہ تھا۔ ۱۹۴۷ء میں دو الگ ریاستیں وجود میں آئی۔ یہ تقسیم مذہبی بنیادوں پر ہندوستانیوں کی جغرافیائی تقسیم تھی۔ جس میں مہاجرین کی بڑی تعداد نے ملک کے ایک خطے سے دوسرے خطے کا رخ کیا۔ اس ہجرت کے دوران قتل و غارت گری، عصمت کی پائمالی، سامان کی لوٹ گھسوٹ اور انسانی اقدار کی کی دھجیاں اڑائی گئی۔ اس ہجرت میں تارکینِ وطن شعراء کی ایک خاصی تعداد نے پاکستان کا رخ کیا۔ وہ ایک شاندار مستقبل کی امید لگائے پاکستان آئے۔ آزادی اپنے ساتھ گوناگوں مسائل بھی لے کر آئی۔ جب ان کو شاندار مستقبل دکھائی نہ دیا تو وہ حال سے نظریں چرانے لگے اور شاندار ماضی اور اپنے آبائی وطن کی یاد میں پناہ لینے لگے۔ اس عہد کے نمائندہ شعراء میں ناصر کاظمی اہم ہیں۔

ڈاکٹر رشید امجد رقمطراز ہیں: "دوسری لہر ہجرت کا دکھ اور چھوڑی ہوئی زمین کی محبت اور اس کی صورت میں نمایاں ہوئی۔۔۔ شاعری میں اس کی نمائندگی ناصر کاظمی کے یہاں عمدگی سے ہوئی۔"(۴۹) ناصر کاظمی کی صورت میں ماضی پرستی نے اردو شاعری میں باقاعدہ رواج پایا۔ وہ ہجرت کے بعد بھی تاعمر انبالہ شہر اور اس کی رونقیں، دوستوں، یاروں کی ٹولیاں، بچھڑے ہوئے لوگوں کی تلاش اور عہد طفلی کی یادیں میں کھوئے رہے۔ ان یادوں نے ان کی شاعری میں مایوسی اور تنہائی کو جنم دیا۔ وہ گزرے ہوئے لمحوں کی بازآفرینی میں اپنا وقت صرف کرتے ہیں۔

پھر کونجیں بولیں گھاس کے ہرے سمندر میں
رت آئی پیلے پھولوں کی تم یاد آئے (۵۰)

نہ سمجھو تم اسے شور بہاراں
خزاں پتوں میں چھپ کر رو رہی ہے
ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصر

اداسی بال کھولے سو رہی ہے [۵۱]

خیالوں ہی میں اکثر بیٹھے بیٹھے

بسالیتا ہوں اک دنیا سہانی [۵۲]

بھری دنیا میں جی نہیں لگتا

جانے کس چیز کی کمی ہے ابھی

یاد کے بے نشاں جزیروں سے

تیری آواز آرہی ہے ابھی [۵۳]

بول اے مرے دیار کی سوئی ہوئی زمیں

میں جن کو ڈھونڈ تا ہوں کہاں ہیں وہ آدمی [۵۴]

پکارتی ہیں فرصتیں کہاں گئیں وہ صحبتیں

زمیں نگل گئی انھیں کہ آسمان کھا گیا [۵۵]

ہوا چلی تو پنکھ پنکھیرو بستی چھوڑ گئے

سونی رہ گئی کنگنی، خالی ہوئے منڈیر [۵۶]

رفتگاں کا نشاں نہیں ملتا

اگ رہی ہے زمیں پہ گھاس بہت [۵۷]

وہ ساحلوں پہ گانے والے کیا ہوئے

وہ کشتیاں چلانے والے کیا ہوئے

یہ کون لوگ ہیں مرے ادھر ادھر

وہ دوستی نبھانے والے کیا ہوئے [۵۸]

آزادی کے بعد نئے ماحول میں سیاسی، سماجی، ثقافتی، تہذیبی اور معاشی آسودگی جیسے مسائل نے سر اٹھایا تو قنوطیت کے سائے مزید گہرے ہونے لگے۔ ایسے حالات میں ملک سے بیزاری اور ناراضگی نے جنم لیا۔ ادباء کی ایک کثیر تعداد نے بہتر

مستقبل کے لیے ملک کو خیر آباد کہا اور دیارِ غیر جا بسے۔ان شعرا کی دوہری ہجرت نے ان کو اندر سے کاٹ کر رکھ دیا۔جس کے نتیجہ ناسٹلجیائی عناصر کی صورت میں نکلا۔ان شعرا کی ایک لمبی فہرست ہے جن میں سجاد شمسی،فارغ بخاری، محمد صادق جامی، جامی ردولوی، جواہریا، احسن جاوید، شہرت بخاری، منیر دہلوی، حبیب حیدر آبادی، یوسف قمر، ڈاکٹر سعید اختر دورانی ،سید ریاست رضوی، اقبال مرزا، اختر ضیائی، نصیر احمد بٹ ناصر، باقر رضوی، عاصی کاشمیری اور عبد اللہ ساحر شیوی وغیرہ شامل ہیں۔ان شعرا کی شاعری میں یاد ماضی اور مراجعت کی خواہش کے عناصر کی جھلک واضع دیکھی جا سکتی ہے۔

پتا کیا پوچھتے ہیں آپ ہم صحرا نوردوں سے

نہ اپنا شہر ہے باقی، محلہ ہے، نہ گھر باقی[۵۹]

برطانیہ میں اردو شاعری کی روایت،، سجاد شمسی 87 ص

عجیب بے سمت سے سفر پر رواں ہیں فارغ

مسافتوں ہی میں اب کوئی انقلاب آئے[۶۰]

برطانیہ میں اردو شاعری کی روایت، فارغ بخاری، 39 ص

سوچتا ہوں وہ تیری جلوہ گہِ ناز نہ ہو!

اپنے دشمن کا بھی دل مجھ سے دکھائے نہ بنے

کتنی ہی تلخ نہ ہو، ماضی میں کشش ہے ایسی

یاد کرتے نہ بنے اور بھلائے نہ بنے[۶۱]

برطانیہ میں اردو شاعری کی روایت، محمد صادق جامی، 95 ص

کراچی میں مہاجر اور انگلستان میں کالے

تری تقدیر میں جامی لکھی ہے خانہ بربادی[۶۲]

برطانیہ میں اردو شاعری کی روایت، جامی ردولوی، ص 97 ص

پایا ہے جہاں کچھ، وہیں کھویا ہے بہت کچھ

ہجرت میں ہوا ہے ہمیں نقصان زیادہ[۶۳]

برطانیہ میں اردو شاعری کی روایت، اکبر حیدرآبادی، ص100

ہماری زیست تو خوگر تھی دشتِ غربت کی

اچانک آج کہاں آگئی ہے یادِ وطن (۶۴)

برطانیہ میں اردو شاعری کی روایت، یوسف قمر، 118

ii۔ تارکینِ وطن اور ترکِ وطن کی وجوہات:

گزشتہ چند دہائیوں سے تارکین وطن کی اصطلاح اقوامی اور بین الاقوامی سطح پر سننے اور پڑھنے کو ملتی آرہی ہے۔ یہ اصطلاح ایک وطن سے دوسرے وطن ہجرت کرکے جابسنے والے لوگوں کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ یہ دو لفظوں تارک اور وطن سے مل کر تارکین بنی ہے۔ تارکین، تارک کی جمع ہے۔ تارکین وطن پر گفتگو کرنے سے قبل اس اصطلاح کے معنی اور مفہیم پر روشنی ڈالی جائے گی تاکہ اس کے معانی اور مفہیم واضع ہوں۔ فیروز الغات کے مطابق: "تارک (تا۔رک) (ع۔صفت) تیاگی۔ چھوڑنے والا۔ ترک والا۔ جمع: تارکین "(۶۵) مذکورہ بالا معنی سے یہ واضع ہوتا ہے کہ کسی جگہ کو چھوڑنے اور ترک کرنے والے کو تارکینِ وطن کہا جاتا ہے۔ اس ترک وطن میں فرد کی مرضی شامل ہوسکتی ہے اور اس مرضی کے پس پشت کئی عوامل بھی کارفرما ہوسکتے ہیں۔ علاوہ ازیں جبر اور تشدد بھی شامل ہوسکتا ہے۔ ایسے حالات میں فرد نہ چاہتے ہوئے بھی ہجرت کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ جبکہ وطن کے معنی فرد کی پیدائش کی جگہ ہے۔ فیروز الغات میں وطن کے معنی درج ہیں: "(و۔طن)(ع۔ا۔مذ)(1) پیدا اور رہنے کی جگہ (2) دیس۔ اپنا ملک۔ جنم بھومی۔ جمع: اوطان۔ اردو جمع: وطن۔ وطنوں۔ "(۶۶)

مذکورہ بالا معنی سے واضع ہوتا ہے کہ وطن اس خطے یا علاقے کو کہتے ہیں جہاں فرد پیدائش اور بچپن گزرا ہو۔ یا آباؤاجداد کا تعلق اس علاقے سے ہو۔ تارکین وطن کے انگریزی زبان Diasporaکا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ آکسفورڈ ریڈلر نگس ڈکشنری میں درج ہیں:

> "The movement of people from any nation or group away from their own country; people who have moved away from their own country."(۶۷)

مذکورہ تعریف کے پیش نظر یہ کہہ سکتے ہیں کہ تارکین وطن کسی فرد، گروہ یا قوم کے لوگوں کی وطن سے دور نقل و حرکت ہے۔ یا کسی اور صورت میں ملک سے دور جا کر آباد ہوئے ہوں۔

ویکیپیڈیا میں راقم ہے: "اپنے وطن سے ہجرت کر کے کسی دوسرے وطن میں جا بسنے والے لوگ تارکینِ وطن کہلاتے ہیں۔"(۶۸) مذکورہ بالا تعریف میں ایک جگہ سے دوسری جگہ جا کر آباد ہونے کے دوران ہونے والے عمل کے لیے لفظ ہجرت استعمال کیا گیا ہے۔ جو کہ ایک فطری عمل ہے۔ انسان کا عالم ارواح سے ناسوت کا سفر ہجرت ہے۔ یہ انسانی سرشت میں ہے۔ گویا انسانی زندگی انسانی جبلت کے عین مطابق ہے۔ انسان ذہنی و جسمانی دونوں صورتوں میں پابند سلاسل نہیں رہ سکتا۔

فرہنگ آصفیہ میں درج ہے: "ہجرت: جدائی، معارفت، وطن کو ہمیشہ کے واسطے چھوڑ دینا، کنبہ سے جدا ہونا، چھوڑ دینا۔"(۶۹)

ہجرت کے اصطلاحی معنی آبادکاری یا ترک وطن کے کیے جاتے ہیں۔ ہجرت خواہشات کی تکمیل کے لیے انفرادی سطح پر ایک علاقے سے دوسرے علاقے یا اجتماعی سطح پر کوئی گروہ یا قوم کا کسی ایک ملک سے اس کے سیاسی، معاشی، معاشرتی، تہذیبی اور مذہبی جبر سے تنگ آکر دوسرے ملک چلے جانے کا عمل ہے۔ ہجرت کرنے والے تارکین کئی ایک وجوہات کی بنیاد پر اپنی آبائی سرزمین کو چھوڑتے ہیں۔ اس میں سب سے بڑی وجہ بہتر زندگی جینا ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہے:

> "بے شک ایسے لوگوں کی جان فرشتے قبض کرتے ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو گہنگار کر رکھا تھا تو وہ ان سے کہتے ہیں کہ تم کس کام کے تھے؟ وہ کہتے ہیں کہ ہم سرزمین میں محض مغلوب تھے، وہ کہتے ہیں کیا خدا تعالیٰ کی سرزمین وسیع نہ تھی تم کو ترک وطن کر کے اس میں چلا جانا چاہیے تھا۔ سو ان کے لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے اور جانے لیے وہ بری جگہ ہے۔"(۷۰)

گویا اللہ تعالیٰ کو ہجرت کا عمل پسند ہے۔ اس نے ہجرت کرنے والوں لیے کے لیے روز قیامت بہترین انعام رکھا ہے۔ وہ ایک جگہ پر مغلوب لوگوں کو ناپسند کرتا ہے۔ اس کی زمین بہت وسیع ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ جمود کا شکار نہ ہو بلکہ فعال کردار ادا کرے۔ حرکت زندگی کی علامت ہے۔ عموماً یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ یہ جرت بہت کم لوگ کرتے ہیں کہ وہ ایک علاقے کو ترک کر کے کسی دوسری جگہ آباد ہوں۔

ترک وطن کی عموماً دو بڑے محرک ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ کسی شخص یا طبقے سے مایوسی، ملازمت سے محرومی، سیاسی و سماجی دباؤ کے تحت ہجرت ہے جبکہ دوسرا، دنیاوی فوائد جس کی طرف مذکورہ بالا پیراگراف میں توجہ

دلوائی گئی ہے۔ دنیا کی تاریخ میں ہر طرح کے تارکین وطن کے پیچھے یہی عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ تارکین وطن کو درج ذیل اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱۔ آبادکار

۲۔ پیشہ ور کام کرنے والے تارکین

۳۔ ٹھیکے پر کام کرنے والے کارکن

۴۔ پناہ کے متلاشی خانہ بدوشی

۵۔ غیر قانونی تارکین وطن

بیسویں صدی میں انسانی تاریخ کی سب سے بڑی ہجرت ہوئی۔ ان تارکین وطن نے ایک ایسی یوٹوپیا ریاست کا خواب آنکھوں میں سجایا ہوا تھا جو کہ پاکستان کی صورت میں انہیں تعبیر ہوتا ہوا دکھائی دیا۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی جو ان تارکین کو اس مثالی ریاست میں ہجرت کے دوران یا ہجرت کے بعد درپیش آئی۔ یہ ہجرت مذہبی بنیادوں پر ہوئی۔ جس کا ادراک بعد میں ہوا۔ ابوالکلام آزاد نے اس حوالے سے فتویٰ بھی دیا۔ جس نے وہاں کے مسلمانوں کو ہجرت کرنے کے جذبے کو مزید طول دیا۔

ابوالکلام آزاد رقمطراز ہیں:

"ان تمام مسلمانوں کے لیے جو اس وقت ہندوستان میں سب سے بڑا اسلامی عمل انجام دینا چاہیں ضروری ہے کہ ہندوستان سے ہجرت کر جائیں۔"(۱۷)

تارکین جوق درجوق ہندوستان سے ہجرت کرکے افغانستان، پاکستان اور ہندوستان میں آباد ہوئے۔ یہ ہجرت ایک کرب ناک ہجرت تھی۔ اس ہجرت کے دوران فسادات، قتل وغارت، لوٹ گھسوٹ، جلاؤ گھیراؤ اور عصمتوں کی پائمالی بھی ہوئی۔ اس تجربے کو اس وقت کے ادباو شعراء نے نہ صرف محسوس کیا بلکہ اس کا بھرپور اظہار بھی کیا۔ اس تجربے نے فرد میں حال سے بیزاری پیدا کیں۔ جس کے نتیجے میں فرد عدم تشخص، عدم تحفظ، زمینی اور تہذیبی وثقافتی ورثے سے دوری جیسے جذبات پیدا کیے۔ جس سے تنگ آکر فرد ناسٹلجیا کا شکار ہوا۔ اس وقت کے ادباو شعراء نے اس رجحان کی نمائندگی کی۔ ان ادباو شعراء میں ناصر کاظمی، احمد مشتاق، فیض احمد فیض، کرشن چند، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، خدیجہ مستور، انتظار حسین اور مستنصر حسین تارڑ کا نام قابل ذکر ہے۔

تقسیم کے بعد پاکستان کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی حالات دن بہ دن تنزلی کا شکار ہوتے گئے۔ جنرل ایوب خان سے لے کر جنرل مشرف تک چار فوجی مارشل لاء جبکہ دیگر سول حکومتوں کا بننا اور ٹوٹنا، ۱۹۷۱ء میں تقسیم بنگال جیسے کربناک سانحہ، ۱۹۸۰ء میں سویت یونین کا ٹوٹنا، غیر ملکی تارکین کی مدد، عالمی سطح پر ۹/۱۱ کا واقعہ، پڑوسی ممالک میں امریکن کی مداخلت اور پاکستانی سرزمین کا پڑوسی ممالک کے خلاف استعمال، جیسے محرکات نے ملک میں افرتفری، دہشتگردی، فرقہ وریت، عدم تحفظ، سیاسی عدم استحکام، آئے دن بڑھتی ہوئی مہنگائی اور بے روزگاری جیسے بحران کو پیدا کیا۔ ان حالات وواقعات سے تنگ آکر نوے کی دہائی سے لے کر اکیسویں صدی کے اول میں پاکستانی تارکین وطن کی ایک بڑی تعداد نے یورپین ممالک کا رخ کیا ہے جو کہ تاحال بھی جاری ہے۔ پاکستانی تارکین وطن کی ایک بڑی تعداد نے جہاں دیگر ممالک کا رخ کیا وہاں برطانیہ کا بھی رخ کیا۔ برطانیہ منتقلی کی کئی ایک محرکات ہیں۔

ڈاکٹر شیر علی رقمطراز ہیں:

"برصغیر پاک وہند کے باشندوں نے پچھلی چند صدیوں میں برطانیہ کا سفر اختیار کیا۔ اس سفر اور وہاں پر مختصر یا مستقل قیام کی کئی وجوہات ہیں۔ تعلیمی، سیاسی، سماجی، ثقافتی اور تہذیبی وجوہات کے علاوہ غالباسب اہم وجہ معاشی آسودگی ہے۔"(۴۲)

مذکورہ بالا محرکات نے تارکین وطن کو بہترین سوسائٹی میں تولا کھڑا کیا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کو اس نئی سوسائٹی میں گلنے ملنے میں کئی ایک مسائل کا بھی سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ان مسائل میں شہریت، نئی تہذیب وثقافت میں کھلنا ملنا، رابطے کے لیے زبان سے ناواقفیت، مذہبی عبادات ورسومات میں آزادی، سماجی اور اخلاقی اقدار کا ڈر شامل ہے۔ جس نے وہاں کے افراد میں ناسٹلجیا کو پیدا کر دیا ہے۔

ڈاکٹر شیر علی رقمطراز ہیں: "برطانیہ میں مقیم باشندوں کی پریشانیاں کئی نوعیت کی ہیں۔ ان میں سب سے اہم پریشانی اپنے مذہب، زبان، تہذیب اور سماجی واخلاقی اقدار سے دوری اور لاتعلقی کا خوف ہے۔"(۴۳) درج بالا مسائل نے تارکین وطن کو ناسٹلجیا کا شکار بنا دیا ہے۔ آج جب تارکین وطن سے گفتگو کی جائے تو ہر شخص بہتر سوسائٹی میں رہنے کو توترجیحی دیتا ہے لیکن اس سوسائٹی میں درپیش مسائل کی وجہ سے مراجعت کی خواہش رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خوشگوار ماضی میں جیتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

نبی احمد رقمطراز ہیں:

"یہ لوگ ترقی یافتہ ممالک میں اپنی انفرادی حیثیت تو برقرار نہ رکھ سکے مگر انھوں نے اپنی زبان، وطن اور اپنے ماضی کے ساتھ رابطہ رکھا اور انہیں وہاں جاکر بھی اپنا وطن، اپنا شہر، اپنا گاؤں اور دوست احباب یاد آتے ہیں جہاں ان کی یادیں تھیں، یادوں سے دور ہونا انسان

کے بس میں نہیں ہے۔ وہ جتنا دور جانے کی کوشش کرتا ہے۔ یادیں اتنی شدت سے دبوچ لیتی ہیں۔"(۷۴)

معاشرے کا سب سے حساس طبقہ ادباشعراء کا ہوتا ہے۔ وہ سوسائٹی سے ہٹ کر سوچتے اور محسوس کرتے ہیں۔ انہیں گفتگو کرنے کا سلیقہ اور بات بنانا آتی ہے۔ یہ طبقہ جہاں بین ہوتا ہے۔ جو کہ حالات حاضرہ پر گہری نگاہ رکھے ہوئے ہوتا ہے۔ عہدِ حاضر میں جہاں پاکستان میں سیاسی کشمکش اور معاشی آسودگی کی وجہ سے مختلف طبقے ہائے فکر کے لوگ ترکِ وطن کرنے پر مجبور ہیں۔ وہی ادباشعراء کی ایک خاصی تعداد بھی شامل ہے۔ جو ترکِ وطن کرکے غریب الوطنی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ لوگ یورپ کے مختلف ملکوں میں مقیم ہیں لیکن شعراء کی ایک بڑی تعداد برطانیہ کو اپنا مسکن بنائے ہوئے ہیں۔ برطانیہ میں مقیم شعراء کی ایک روایت موجود ہے۔ جو مختلف نامساعد حالات کی وجہ سے ہجرت کرتے رہے ہیں۔ ان شعراء نے وہاں کی معاشرت میں درپیش مسائل کو ادب کی مختلف اصناف میں موضوع بنایا ہے۔ اس نئی طرزِ معاشرت کے اثرات ادب میں نمایاں دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس طرزِ معاشرت نے فرد کو تنہا کیا ہے۔ اس تنہائی سے فرد ناسٹلجیا کا شکار ہوا ہے۔ یہاں کے لوگ حال سے بیگانہ ہو کر ماضی میں پناہ لیے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ جو تخلیقی سطح پر پاکستانی تہذیب و ثقافت اور معاشرت سے جڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔

iii۔ پاکستانی تارکین وطن شعراء کا تعارف (ساقی فاروقی، منصور آفاق، احمد مشتاق، علی ارمان) احمد

احمد مشتاق:

قیامِ پاکستان کے بعد شعری افق پر چمکنے والے ستاروں میں احمد مشتاق نمایاں ہیں۔ وہ یکم مارچ ۱۹۳۳ء کو ہندوستان کے شہر امرتسر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم امرتسر سے حاصل کی۔ اسی عرصے میں فسادات شروع ہوئے اور ان کا خاندان ہجرت کر کے لاہور کے علاقے گوالمنڈی میں آباد ہوا۔ آپ نے میٹرک ۱۹۴۸ء میں مسلم ہائی اسکول خزانہ گیٹ لاہور سے پاس کیا، بی۔ اے پرائیوٹ جبکہ ایم اے اردو ۱۹۶۶ء میں پنجاب یونیورسٹی سے اول درجے میں پاس کیا۔ آپ کے والد محترم شعر و شاعری سے شغف رکھتے تھے۔ ان کی صوبت کا اثر تھا کہ آپ نے زمانہ طالب علمی میں تک بند کرنا شروع کر دی۔

احمد مشتاق رقمطراز ہیں:

"آٹھویں جماعت کے آخر ہوتے ہوتے میں نے تک بندی شروع کر دی تھی۔ میرے والد صاحب کو بھی کبھی شاعری میں دلچسپی رہی ہو گی۔ کبھی کبھی موڈ میں ہوتے تو مجھے بہادر شاہ ظفر، داغ، شہدی اور چرکین کے شعر سناتے شاغ کے مصرع طرح "ہائے جلسے شراب خانے کے "پر انھوں نے بھی ایک چھوٹی سی غزل کہہ رکھی تھی۔"(۷۵)

گویا یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو شاعری کی سوجھ بوجھ وراثت میں ملی لیکن اس شوق کو قیام پاکستان کے بعد لاہور میں پر لگے۔ جہنوں نے آپ کو ایک غیر معمولی شاعر بنا دیا۔ آپ کا اصل نام مشتاق احمد ہے لیکن نام کی ترتیب کو تھوڑا بہت الٹ کر اسے مزید چار چاند لگا دیے۔ وہ تخلص کو اہمیت نہیں دیتے۔

احمد مشتاق رقمطراز ہیں:" تخلص رکھنے کو میں اچھا نہیں سمجھتا یہی وجہ ہے کہ تخلص سے ۔۔۔۔ کرنے کے لیے میں نے نام میں تھوڑی بہت تبدیلی کر دی۔"(۷۶)

قیام پاکستان کے بعد پاک ٹی ہاؤس میں ان کی ملاقات ناصر کاظمی سے ہوئی۔ جس کے بعد یہ ملاقات دوستی میں بدل گئی۔ اس زمانے میں ٹی ہاؤس میں بیٹھنے والے ادباء و شعراء میں انتظار حسین، مظفر علی سید، غالب احمد، حنیف رامے، شاہد حمید اور شیخ صلاح الدین تھے۔ اس ادبی ماحول میں آپ کی شاعری پروان چڑھی۔

ناصر کاظمی رقمطراز ہیں:

"اجنبی رہزنوں نے لوٹ لیے
کچھ مسافر ترے دیار سے دور

جب میں نے اس سے شعر سنا تو یوں لگا جیسے یہ میری اپنی کہانی ہے احمد مشتاق سے میری دوستی کی بنیاد یہ ہے کہ وہ گھر سے ایک شاعر کا دل لے کر آیا تھا۔" (۷۷)

انہوں نے دیکھتے ہی دیکھتے غزل میں اپنی انفرادیت قائم کی۔ جس میں موضوعاتی اور اسلوبی تنوع تھا۔ جس کی بنیاد حیات و کائنات کا گہرا مشاہدہ، مقامی عالمی ادب کا مطالعہ، اور غور و فکر تھی۔ ان کی غزل کے حوالے سے سہیل احمد خان رقمطراز ہیں:

"انھوں نے جدید غزل میں ایک ایسا شفاف، شیشے کی طرح آر پار نظر آنے والا اسلوب پیدا کیا ہے۔ جس میں چھوٹی چھوٹی تصویریں بنانے والے تاثرات کے رنگوں کو گرفت میں لاتے ہیں۔ مگر ان کا کمال یہ ہے کہ ان کی شاعری میں یہ جذبے رسمی غزلیہ انداز میں نہیں آتے وہ انہیں نئی تصویروں میں دکھاتے ہیں۔"(۷۸)

وہ سات عشروں سے شعر کہہ رہے ہیں۔ان کے شعری مجموعوں میں "مجموعہ "۱۹۶۶ء ، "گردِ مہتاب" ۱۹۸۱ء، "اوراق خزانی"۲۰۱۵ء اور کلیات احمد مشتاق ۲۰۲۱ء میں چھپ چکے ہیں جبکہ تراجم میں "اندھے لوگ" ۲۰۱۳ء اور "بنجر میدان"۲۰۱۳ء شامل ہیں۔ اس کے علاوہ "ہجر کی رات کا ستارہ" کے عنوان سے مضامین کا مجموعہ لکھ کر شائع ہو چکا ہے۔۱۹۷۸ء میں "محراب" کے عنوان سے ایک کتابی سلسلہ شروع کیا۔ مختلف شعری و نثری تراجم پر مشتمل "حدیث دیگراں" کے عنوان سے ایک کتاب بھی چھپ چکی ہے۔

آپ نے عملی زندگی کا آغاز الہ آباد بنک سے شروع کیا جو بعد ازاں ۱۹۵۷ء میں سٹنڈرڈ چارڈ بنک میں ضم ہوا۔ ۱۹۸۴ء میں امریکہ چلے گئے۔ وہاں بھی چارٹر بنک میں ملازمت جاری رکھی۔ ۱۹۹۸ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد فلوریڈ میں چار سال قیام کیا ۲۰۰۲ء میں ہیوسٹن چلے آئے۔ آج کل وہ ہیوسٹن میں مقیم ہیں۔

ا۔ساقی فاروقی:

اردو ادب کے جدید شاعروں میں ساقی فاروقی کا شمار ہوتا ہے۔وہ تقسیم ہند سے قبل ۲۱ دسمبر ۱۹۳۵ء کو گورکھپور (اترپردیش) میں پیدا ہوئے۔ آپ کے دادا (خان بہادر) قاضی خیرات نبی صدیقی مجسریٹ تھے۔ آپ کا نام آپ کے دادا قاضی محمد شمشاد نبی صدیقی نے رکھا۔ آپ کے نانا کا نام قاضی محمد غلام حسین فاروقی تھا۔ نانا اور دادا کے نام کی نسبت سے ادبی دنیا میں ساقی فاروقی کہلوائے۔ اس حوالے وہ خود رقمطراز ہیں:

> "دادا کا نام (خان بہادر) قاضی محمد خیرات بنی صدیقی تھا۔نانا کا نام قاضی محمد غلام حسین فاروقی تھا، میں نے اپنے ادبی نام کے لیے انھی کی نسبت اختیار کی۔اس کے دو اسباب تھے۔ایک تو یہ کہ اماں کو خوش کروں دوسرا یہ کہ ابا کو بتاؤں کہ دادا سے محبت تو بہت کرتا ہوں مگر کاش وہ خان بہادر کا خطاب واپس کر دیتے۔اب سوچتا ہوں کہ یہ ایک رومانی اعتراض تھا۔"(۷۹)

ساقی فارقی نے جس خاندان میں آنکھ کھولی تھی وہ تقسیم ہند سے قبل ایک زمیندار گھرانہ تھا۔اس خاندان کی ٹھاٹ نرالی تھی۔ ساقی کی طبعیت اور شخصیت میں خاندانی وقار تا دم مرگ رہا۔وہ خاندانی پس منظر کے حوالے سے رقمطراز ہیں:

> "میں ایک خوش حال متوسط درجے کی زمیں دار گھرانے میں پیدا ہوا۔ گاؤں پر لالا دواد کا ناتھ کے خاندان کا اور آدھے پر ہمارے خاندان کا کنٹرول تھا۔ دونوں خاندان کے پاس تین تین کھوٹھیاں اور دو باغات تھے۔ ہماری ابلائیں اور خواتین ایک دوسرے کے ہاں ڈولیوں پر آتی جاتی رہتیں اور ڈولیوں میں بھی برقع پہنے یا گھونگھٹ ڈالے رکھتیں۔۔۔ان کے علاوہ دادا نے میری دیکھ بھال اور سیر و تفریح کے لیے ایک خاص نوکر صاحب جان کو متعین کر دیا۔" (۸۰)

ساقی فاروقی کی ابتدائی تعلیم کا اہتمام گھر پر کیا گیا۔سیتاپور میں ابھی ساتوں جماعت میں پڑھ رہے تھے کہ تقسیم ہند کا واقع پیش آیا۔ان کے خاندان نے ہجرت کر کے پہلے مشرقی پاکستان اور پھر کراچی بہار کالونی کو اپنا مسکن بنایا۔ہجرت کے حوالے سے خود رقمطراز ہیں:"بارہ برس کا تھا کہ ہندوستان نے مجھے اور میں نے ہندوستان کو چھوڑا۔"(۸۱)

ہجرت کے بعد کراچی سے بی۔اے اور گرایجویشن کی ڈگری لی۔ایم۔اے انگریزی کے لیے یونیوسٹی میں داخلہ لیا لیکن تعلیم ادھوری چھوڑ کر ۱۹۶۳ء میں لندن چلے گئے۔برطانیہ کا ماحول ایسا راس آیا کہ عمر بروہی سکونت اختیار کیے رکھی۔شاعری اور مطالعہ کا آغاز زمانۂ طالبعلمی میں رحمت اللہ ماڈل ہائی اسکول سے ہوا۔اسی اسکول کی لائبریری میں وحشت کلکتوی، جگرمرادآبادی، اختر شیرانی، اصغر گونڈوی، اکبرالہ آبادی، الطاف حسین حالی، میر وغالب اوراقبال سے واسطہ پڑا جن سے آپ نے حسبِ استطاعت استفادہ بھی کیا۔اسی زمانے میں ترقی پسند ادب بھی ان کے مطالعہ میں رہا۔آغاز میں اسی طرز پر شاعری کی لیکن جلد ہی ایک نئ روش پر چل نکلے۔وہ شاعری میں اقلیت کے نمائندہ تھے۔ترقی پسند شاعری کے حوالے سے ان کا ایک خاص نقطہ نظر تھا۔

وہ اس حوالے سے راقمطراز ہیں:

> "۔۔۔لیکن بیش تر ترقی پسند شاعروں نے اصلی انسان کی نہیں بلکہ انسان کی اس شبیہ کی پوجا کی جو ان کے رومانی ذہنوں نے بنا رکھی تھی۔ان کی ناکامی کا سبب یہ نہیں تھا کہ خدانخواستہ ان کی نیت خراب تھی یا عوام کے خیر کے جذبات بری چیز ہیں بلکہ یہ کہ شعری جمالیات اور شعری لسانیات کے ساتھ وہ اپنے ابھرے جذبات کی آبیاری نہ کر سکے۔"(۸۲)

۱۹۵۲ء میں باقاعدہ شاعری کا آغاز کیا۔۱۹۵۲ء سے ۱۹۶۳ء تک آپ کی غزلیں نظمیں ،لیل ونہار،سویرا، امروز،ادب لطیف، فنون،افکار، جنگ، نیادور اور مشرب میں چھپتی رہی۔اس عرصہ میں ریڈیو کے لیے گیت اور نغمے لکھے بالخصوص بچوں کے لیے نظمیں بھی لکھیں جو"نونہال"میں چھپتی رہی۔اس کے علاوہ "نوائے کراچی"کے ایڈیٹر بھی رہے۔ان کی تصانیف میں ،"پیاس کا صحرا(نظمیں) ،"بہرام کی واپسی"،"رازوں سے بھرا بستہ"،"سرخ گلاب"،"بدر منیر"،"غزل ہے شرط"،"زندہ پانی"،"حاجی بھائی پانی والا"،"رات کے مسافر"،"رادار"،"ہدایت نامہ شاعر"(تنقیدی مضامین)، بازگشت وبازیافت، اور انگریزی نظموں کا مجموعہ Nailing Park Storms شامل ہیں۔

۲۔ منصور آفاق:

دور جدید کے منفرد اور ممتاز شاعر، ڈرامانگار، نقاد اور صحافی منصور آفاق ۱۷ جنوری ۱۹۶۲۱۹۵۲ء کو میانوالی میں پیدا ہوئے۔ان کا اصل نام محمد منصور آفاق جبکہ قلمی نام منصور آفاق ہے۔انہوں نے لٹریچر میں ماسٹر کی ڈگری جامعہ پنجاب سے لی۔کم عمری میں ہی لکھت پرت کا شوق پیدا ہوا۔انہوں نے نعت گوئی، نظم نگاری، غزل

گوئی، ڈرامانگاری، ناول نگاری، کالم نگاری اور تحقیق و تنقید میں طبع آزمائی کیں اوران اصناف بالخصوص غزل میں شہرت میں شہرت دوام حاصل کی۔

آپ کا باقاعدہ شعری تعارف ۱۹۸۴ء میں نعتیہ مجموعہ "آفاق نما" کے عنوان سے چھپااور خاص وعام میں شہرت حاصل کی۔ دوسرا شعری مجموعہ ۲۰۰۴ء میں "نیند کی نوٹ بک" کے عنوان سے چھپا جس میں ایک نئے ذائقے کی غزلیں شامل تھیں۔ جس نے جدید غزل میں ان کی شناخت کو قائم کیا۔اس کے بعد ۲۰۰۷ء میں نظموں کا مجموعہ "میں عشق میں ہوں"، ۲۰۰۹ء میں نظموں کا ایک اور مجموعہ "عہد نامہ" جبکہ ۲۰۱۴ء میں "دیوان منصور" چھپا۔ شعری مجموعوں کے علاوہ ۲۰۲۲ء میں "آ قا قافا" کے عنوان سے ناول چھپا۔ اس کے علاوہ ڈرامانگاری میں "زمین"، "شام"، "نمک"، "جانڑاں"، "پتھر اور دنیا" شام ہیں۔ ۱۹۹۳ء میں تنقیدی کتاب "وہ اور عطا الحق قاسمی"، ۱۹۹۶ء میں "گل پاشی"، ۱۹۹۸ء میں سرائیکی گرائمر، ۲۰۰۸ء میں "عارف نامہ" شائع ہوئی۔ کالم نگاری میں ایک عرصے سے روزنامہ جنگ میں "دیوار پر دستک" کے عنوان سے لکھ رہے ہیں۔ آپ نے ۲۰۰۲ء میں برطانیہ سے ادبی میگزین "انکوٹ" نکالا۔ اب بھی علم وادب کی خدمت میں سر گرداں ہیں۔

ان کی شاعری کے حوالے سے ظفر اقبال رقمطراز ہیں: "منصور آفاق نے شاعری کو ایک ایسے نئے ذائقے سے روشناس کرایا ہے جو کم از کم غزل میں پہلے موجود نہیں تھا۔" (۸۳)

۳۔ علی ارمان:

کسی بھی زبان کے ادب میں نوجوان لکھاری مستقبل کا قیمتی سرمایہ ہوتے ہیں۔ اردو شاعری کا مستقبل اس حوالے سے تابناک ہے کہ اس کی بھاگ ڈور ایسے نوجوانوں شعراء کے ہاتھ میں ہے جو امکانات سے بھرپور ہیں۔ ان شعراء کی تربیت باقاعدہ اساتذہ کے ہاتھ سے ہوئی ہے۔ جو عہد حاضر میں مفقود دکھائی دیتی ہے۔ انہی شعراء کی فہرست میں ایک نام علی ارمان کا ہے۔

علی ارمان ۲۵ اگست ۱۹۷۳ء میں پاکستان کے شہر راولپنڈی کے علاقے مور گاہ میں چودھری حنیف کے گھر پیدا ہوئے۔ ان کے والد ملازمت کے حصول کے لیے لیبیا اور ترکی میں مقیم رہے۔ اس کے علاوہ رئیل اسٹیٹ کے کاروبار سے بھی وابستہ رہے ہیں۔ علی ارمان نے ابتدائی اور دینی تعلیم گھر پر حاصل کی جبکہ گورنمنٹ گورڈن اوراصغر مال کالج میں سے فیض یاب ہوئے۔ اکیسویں صدی کے آغاز میں انہوں نے تلاشِ معاش کے سلسلے میں برطانیہ کو اپنا مسکن بنایا۔ برطانیہ میں قیام کے دوران برک بیک یونیورسٹی لندن سے فلسفے میں ڈگری لی۔ زمانہ طالب

علمی میں کتاب سے دوستی ہوئی جو اب تک جاری ہے۔ان کو کم عمری میں شعر و شاعری سے شغف ہوا۔پاکستان میں قیام کے دوران حلقہ ارباب ذوق اور حلقہ ارباب غالب سے وابسطہ رہے۔جہاں ان کی تربیت بہترین اساتذہ نے کیں۔ان اساتذہ میں یوسف حسن،اختر عثمان،نثار ناسک، جلیل عالی،افتخار عارف،عدیم ہاشمی اور محبوب خزاں وغیرہ شامل تھے۔

ڈاکٹر شیر علی رقمطراز ہیں:"ان کی غزل کا لہجہ کلاسیکی پیرایہ اظہار کے باوجود جدت اور تازگی کا حامل ہے۔اس جدت اور تازگی کی بنیادی وجہ ان کے ہاں مضامین کا تنوع اور اسلوبِ بیاں کا انوکھا پن ہے۔"(۸۴)

آپ کے شعری مجموعوں میں "سخن تصویر تک پہنچا"اور "مجھے چاند چاہیے "چھپ کر خواص وعام میں مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔اس کے علاوہ پوٹھوہاری شاعری سے بھی خاصی رغبت رکھتے ہیں۔پوٹھوہاری شاعری پر مشتمل شعری مجموعہ "مٹی دی بکل"چھپ چکا ہے۔پیشے کے اعتبار لندن میں ایک کمپنی میں بطور ای کامرس ایڈنسٹر سٹر کے طور پر فرائض سر انجام دے رہے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ قراۃ العین حیدر: خصوصی مطالعہ، مرتبین، سید عامر سہیل، علی اظہر، ڈاکٹر، ملتان بیکن بکس، ص ۲۰۰۳، ۵۱۲ء

۲۔ ابو الاعجاز حفیظ صدیقی، ادبی اصطلاحات کا تعارف، اسلوب، لاہور، ص ۲۰۱۵، ۵۲۳ء

۳۔ https://ur.m.wikiedia.org23agu2023، 7:00 PM

۴۔ https://www.dictionary.com/browse/dytopia.، Dystopia.dictionary.com.2017، ۲۳ اگست ۲۰۲۳، 7:00PM

۵۔ آن لائن انگلش ٹو اردو ڈکشنری، ۲۴ اگست ۲۰۲۳ء، www.dictionaryenglishtourdu.com، 8:00 PM

۶۔ Nostalgia.dictionary.cambridge.org.http://dictionary.cambridge.org/dictionary/English/nostalgia.، ۸ جنوری ۲۰۲۴ء، 4:00 PM

۷۔ Nostalgia.Oxfordlearners distionaries.com, http://www.oxfordlearnersdistionaries.com/. Difination/English/nostlgia، ۲۵ جنوری ۲۰۲۴ء

۸۔ Advanced practical Dictionary (English to English and Urdu) with brief general knowledge, Azhar publishers Lahore,Pakistan, P:852, 2000

۹۔ Dictionary of psychology.com، ۱۰ فروری ۲۰۲۴ء، 5:00 A.M

۱۰۔ مرزا حامد بیگ، جانکی بائی کی عرضی (ناسٹلجیا: لالہ جسونت کی حویلی)، دوست پبلی کیشنز، ص ۳۳ تا ۲۰۱۱، ۳۴ء

۱۱۔ احمد سہیل، اردو افسانے کا ناسٹلجیا، ملتان: تدوین پبلی کیشنز، ص ۳۲ تا ۳۳، ۲۰۰۴ء

۱۲۔ رنگا رنگ اردو شاعری (سب رس اور سدا بہار موضوعاتی انتخاب) مرتب ٹی۔ این۔ راز، عبارت پبلی کیشنز، ص ۲۲۲، ۲۰۲۱ء

۱۳۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں (ابتدائی دور سے ۱۹۴۷ء تک)، انجمن ترقی اردو، ص ۱۰۳، ۱۹۹۶ء

۱۴۔ http://www.medicalnewsday.com، ۱۱ مارچ ۲۰۲۴ء، 10:03 A.M، ۲۰۲۴ء

۱۵۔ Marcosa Natali ,History and the politicacs of Nostalgia, lowa journal of cultural studies, 2004

۱۶۔ اظہر فراغ، ازالہ، وراق پبلی کیشنز، لاہور، ص ۲۳

۱۷۔ رنگا رنگ اردو شاعری (سب رس اور سدا بہار موضوعاتی انتخاب)، مرتب ٹی۔ این۔ راز، ص ۲۲۲

۱۸۔ مظفر عباس (مدیر و نگران اعلی) مشمولہ ماہ نو (ناسٹلجیا کے بارے میں چند باتیں مضمون از قاضی جاوید)، ص ۲۲
اکتوبر ۱۹۸

۱۹۔ Routledge,cly.Nostalfia:A psychological resource.Routledge, P: 52-53, 2015

۲۰۔ Routledge, cly.Nostalfia: A psychological resource.Routledge, P :41, 2015

۲۱۔ Routledge,cly.Nostalfia:A psychological resource.Routledge, P:53, 2015

۲۲۔ Routledge,cly.Nostalfia:A psychological resource.Routledge, P:57, 2015

۲۳۔ طبعی، بحوالہ، اردو شہ پارے، (جلد اول) از ڈاکٹر محی الدین قادری زور، حیدر آباد دکن: مکتبہ ابراہیمیہ، طبع اول،
ص ۱۹۲۹، ۲۴۸ء

۲۴۔ کلیات ولی، مرتبہ نور الحسن ہاشمی، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ص ۳۷۳، ۱۹۹۴ء

۲۵۔ ایضاً، ص ۱۲۵

۲۶۔ جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو، جلد دوم، مجلس اردو ادب، لاہور، ص ۳، ۱۹۸۷ء

۲۷۔ سودا، کلیات سودا، مرتبہ، ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی، ص ۸، س ن

۲۸۔ ایضاً، ص ۱۱۳

۲۹۔ ایضاً، ص ۱۳۰

۳۰۔ ایضاً، ص ۶۵۰

۳۱۔ ابو اللیث صدیقی، لکھنؤ کا دبستان شاعری، مقالہ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ص ۳۳۔ س۔ ن

۳۲۔ میر تقی میر، کلیاتِ میر، جلد اول، مرتبہ، کلب علی خاں فائق، مجلس ترقی ادب، لاہور، ص ۴۴۳، ۱۹۸۶ء

۳۳۔ کلیات میر، جلد سوم، مرتبہ: کلب علی خان فائق، مجلس ترقی ادب، لاہور، طبع دوم،، ص ۱۹۹۲، ۲۰۹ء

۳۴۔ ایضاً، ص ۲۳۵

۳۵۔ میر تقی میر، کلیاتِ میر، جلد اول، مرتبہ، ص ۱۰۶

۳۶۔ کلیات میر، جلد سوم، مرتبہ: کلب علی خان فائق، ص ۲۰۹

۳۷۔ نواب مرزا داغ دہلوی، یاد گارِ داغ، مجلس ترقی ادب، لاہور، ص ۵۱۷، ۱۹۸۴ء

۳۸۔ ایضاً، ص ۴۶۹

۳۹۔ ایضاً، ص ۹۰

۴۰۔ ایضاً، ص ۱۱۰

۴۱۔ ایضاً، ص ۳۶

۴۲۔ جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو، جلد دوم، ص ۹

۴۳۔ عارف ثاقب، انجمن پنجاب کے مشاعرے، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ص ۳۰۲، ۱۹۹۵ء

۴۴۔ ایضاً، ص ۳۳۸

۴۵۔ ایضاً، ص ۳۳۹

۴۶۔ ایضاً، ص ۳۴

۴۷۔ ایضاً، ص ۳۴۱

۴۸۔ ایضاً، ص ۳۴۳

۴۹۔ رشید امجد، ڈاکٹر، پاکستانی ادب رویے اور رحجانات، پورب اکادمی، ص ۲۰۱۰، ۳۹ء

۵۰۔ ناصر کاظمی، دیوان ناصر، القا پبلیکیشنز، لاہور، ص ۲۰۱۶، ۸ء

۵۱۔ ایضاً، ص ۱۰ تا ۱۱

۵۲۔ ایضاً، ص ۱۵

۵۳۔ ایضاً، ص ۳۶

۵۴۔ ایضاً، ص ۳۸

۵۵۔ ایضاً، ص ۱۴۴

۵۶۔ ایضاً ،ص۱۴۸

۵۷۔ ایضاً ،ص۱۵۰

۵۸۔ ایضاً ،ص۲۰۱

۵۹۔ شیر علی،ڈاکٹر،برطانیہ میں اردو شاعری کی روایت (آغاز تاعصرِ حاضر)،ص۸۷،۲۰۲۲ء

۶۰۔ ایضاً ،ص۳۹

۶۱۔ ایضاً ،ص۹۵

۶۲۔ ایضاً ،ص ۹۷

۶۳۔ ایضاً ،ص۱۰۰

۶۴۔ ایضاً ،ص۱۱۸

۶۵۔ رنگین فیروزاللغات اردو جامع،مرتبہ الحاج مولوی فیروزالدین مرحوم،فیروز سنز پرائیوٹ لمیٹڈ،لاہور،ص۳۷۰، ۲۰۰۵ء

۶۶۔ ایضاً ،ص۴۸۸

۶۷۔ Oxfordlearnersdictionaries.com ,1.3.2024, 9:48 AM

۶۸۔ http://Ur.m.wikipedia.org 30.2.2024, 8:51 A.M

۶۹۔ سید احمد دہلوی،مرتبہ،فرہنگ آصفیہ،جلد سوم،چہارم (مشترک جلد)،اردو سائنس بورڈ،لاہور،ص۲۰۱۰،۸۰۴ء

۷۰۔ القران،سورۃ النساء،آیت:۹۸

۷۱۔ رشید محمود،راجہ،تحریک ہجرت،مکتبہ عالیہ،لاہور،ص۱۹۹۵،۹۸ء

۷۲۔ شیر علی،ڈاکٹر،برطانیہ میں اردو شاعری کی روایت (آغاز تاعصرِ حاضر)،ص۱۵،۲۰۲۲ء

۷۳۔ ایضاً،ص۱۷

۷۴۔ نبی احمد، مقالہ نگار، اردو غزل میں ہجرت کا تجربہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی، وفاقی اردو یونیورسٹی برائے فنون، سائنس اور ٹیکنالوجی، اسلام آباد، س ن

۷۵۔ مشتاق احمد، مرتب، آدمی ہمارا (شعریاتِ احمد مشتاق)، پیس پبلی کیشنز، لاہور، ص ۲۴، ۲۰۱۹ء

۷۶۔ احمد مشتاق، مجموعہ: احمد مشتاق، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ص ۴۴۰، ۲۰۲۱ء

۷۷۔ مشتاق احمد، مرتب، آدمی ہمارا (شعریاتِ احمد مشتاق)، ص ۲۸

۷۸۔ مشتاق احمد، مرتب، آدمی ہمارا (شعریاتِ احمد مشتاق)، ص ۲۸

۷۹۔ ساقی فاروقی، آپ بیتی / پاپ بیتی، اکادمی بازیافت، ص ۱۴، ۲۰۰۸ء

۸۰۔ ایضاً، ص ۱۲ تا ۱۳

۸۱۔ ایضاً، ص ۲۰

۸۲۔ ایضاً، ص ۲۹

۸۳۔ منصور آفاق، دیوان منصور، وراق مرکز، لاہور، فلیپ، ۲۰۱۴ء

۸۴۔ شیر علی، ڈاکٹر، برطانیہ میں اردو شاعری کی روایت (آغاز تا عصرِ حاضر)، ص ۲۹۳

باب دوم:

پاکستانی تارکین وطن کی شاعری میں یادِ ماضی کے عناصر کا تجزیاتی مطالعہ

پاکستان کے معاشی و معاشرتی حالات، سیاسی و سماجی معاملات، ثقافتی و تہذیبی اور تعلیمی مسائل جبکہ ان سب سے بڑھ کر معاشی آسودگی کے پیشِ نظر سالہاسال خلیجی ریاستوں اور یورپین ممالک میں ہجرت کر کے جا بسنے والے پاکستانی تارکینِ وطن کی ایک خاصی تعداد شامل ہے۔ دیارِ غیر میں جا کر آباد ہونے والے ان تارکینِ وطن کو کئی ایک مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہاں کی تہذیب و ثقافت اور سماجی ماحول تارکینِ وطن کے آبائی علاقوں سے مطابقت نہیں رکھتا۔ لیکن جب بات مشرق اور مغرب کی ہو رہی ہو تو ان دونوں تہذیبوں کے درمیان تصادم اور ثقافتی فرق کی فضا دکھائی دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان سے ہجرت کرنے والے تارکینِ وطن وہاں کے ماحول میں جلد گھل مل نہیں پاتے۔ تہذیبی و ثقافتی فرق اور جغرافیائی اکائیوں کی وجہ سے تارکینِ وطن کو کئی ایک مسائل سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ ان مسائل میں زبان، مذہب، اخلاقی اقدار، تہذیب و ثقافت اور شہریت کا مسئلہ شامل ہیں۔

مذکورہ بالا مسائل سے جب تارکینِ وطن نبرد آزما نہیں ہو پاتے اور وہاں کی معاشرت میں اپنے آپ کو ایڈجسٹ کرنے میں ناکام ہوتے ہیں تو ان کے پاس حال سے فراریت کے سوا کوئی اور چارا نہیں بچتا۔ یہ فراریت ان میں ناسٹلجیائی رجحان کو پیدا کرتی ہے۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر وہ اپنا زیادہ تر وقت گزرے ہوئے خوشگوار لمحات اور پرانی یادوں میں صرف کرتے ہیں۔ جو ان کو راحت اور تسکین کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ انہیں اپنی تہذیب و ثقافت، معاشرت، اخلاقی اقدار اور اپنی مٹی کی یاد رہ رہ کر ستاتی ہے۔ جو ان میں واپسی پلٹنے کی ایک خواہش کو بھی پیدا کرتی ہے لیکن آبائی وطن کے معاشی اور سیاسی حالات ان کی راہ میں روڑے اٹکاتے ہیں۔

شعراء کسی بھی معاشرے کا حساس طبقہ ہوتے ہیں۔ وہ حسیاتی سطح پر معاشرتی کرب کو شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں اور ان محسوسات کو مجسم پیکر بھی دیتے ہیں۔ جہاں پاکستانی تارکینِ وطن سالہاسال ہجرت کرتے ہیں وہاں شعراء کی ایک بڑی تعداد بھی ہجرت کے تجربے سے گزرتی ہے۔ ہجرت کا تجربہ معمولی نوعیت کا نہیں ہوتا۔ یہ دیرپا اثر رکھتا ہے۔ جو ایک کرب کی صورت اختیار کرتا ہے۔ یہ ان کو تخلیقی سطح پر ایک بہترین فن پارہ تشکیل دینے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ ہجرت کرنے والے تارکینِ وطن شعراء میں کچھ ایسے شاعر بھی شامل ہیں

جو اس تجربے سے بارہا گزر چکے ہیں۔ پہلی دفعہ ہجرت کا محرک تقسیم ہند کی صورت میں ایک اسلامی مملکت کا قیام عمل میں آنا تھا جبکہ دوسری دفعہ معاشی آسودگی اور بہتر نظام زندگی جینے کے خواب کو تعبیر دینا تھا۔ دونوں ہجرتیں اپنی نوعیت کے اعتبار سے اہم ہیں۔ ان ہجرتیں کے مختلف نوعیت کے محرکات ہیں۔ یورپ میں جا کر آباد ہونے والے پاکستانی تارکینِ وطن شعراء ہجرت کے تجربات اوروہاں کی نئی معاشرت میں درپیش مسائل کا بھرپور اظہار کر رہے ہیں۔ لیکن ان سب سے زیادہ ان کی شاعری میں یادِ ماضی کے عناصر نمایاں نظر آتے ہیں۔ جس کی بڑی وجہ نئی معاشرت سے قدم ملانے میں ناکامی کی وجہ حال سے بیزاری ہے۔ حال سے بیزاری اور بیگانگی فرد کی شخصیت کو داخلی سطح پر انہدام کا شکار کرتی ہے۔ یہ انہدام فرد کو ماضی میں پناہ گزیں بناتا ہے۔

ا۔ یادِ ماضی:

ماضی کی یادیں مثبت اور منفی ہر دو طرح کے پہلو لیے ہوتی ہیں۔ کوئی بھی فرد ماضی کے تجربات اور یادوں سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔ یہ انسان کے لاشعور میں موجود ہوتی ہیں۔ جو خوشی یا غم کے موقعے پر فرد کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں۔ یادیں انسان کی زندگی کا کل سرمایہ ہوتی ہیں۔ انسان کی سرشت میں ہے کہ وہ حسین یادوں کا ذکر کرنے میں خوشی وراحت محسوس کرتا ہے۔ اوران یادوں میں اپنا زیادہ تر وقت صرف کرتا ہے۔ یہ یادیں اس کو زندہ رہنے کے لیے قوت اور خود اعتمادیت فراہم کرتی ہیں۔ تلخ یادیں عموماً صحت کے لیے مفید ثابت نہیں ہوتی۔ یہ انسان کو ایذ پہنچاتی ہیں۔ وہ ایسی یادوں سے باز رہنے کو ترجیحی دیتا ہے کیوں کہ ایسے لمحات سے دوبارہ گزرنا ایک تکلیف دہ عمل ہوتا ہے۔ ہر گزرتا لمحہ ماضی کا حصہ بنتا ہے۔ جبکہ ہر گزرتا لمحہ ہمیشہ حال سے خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔ ماضی اس وقت زیادہ خوبصورت دکھائی دیتا ہے جب انسان اپنی مٹی سے دور جا کر آباد ہوتا ہے۔

دیارِ غیر بالخصوص یورپین ممالک میں تارکینِ وطن شعراء کو وہاں کی مصروف زندگی میں وقت کی قلت کا شدید احساس ہوتا ہے۔ وہاں کی زندگی میکانکی زندگی ہے۔ جس میں حسیاتی سطح پر احساس کا فقدان ملتا ہے۔ لیکن ان لمحات میں اگر کوئی فرصت کے لمحے ڈھونڈ لائے تو کسی غنیمت سے کم نہیں ہوتے۔ ان لمحات میں آبائی علاقوں میں گزرے ہوئے روز وشب کی حسین یادیں تارکینِ وطن کو خوب ستاتی ہیں۔ تارکین وطن شعراء حسی سطح پر نہ صرف ان کیفیات کو محسوس کرتے ہیں بلکہ اسے اظہار میں بھی لاتے ہیں۔

تارکین وطن شعراء میں احمد مشتاق صاحبِ طرز شاعر ہیں۔ وہ ہجرت کے تجربات کی بھٹی سے بارہا گزر چکے ہیں۔ ان کی شاعری میں اپنے آبائی وطن بالخصوص لاہوراورامر تسر کے گلی کوچوں کی یادیں، دوست

واحباب کے ساتھ گزرے لمحے، عہد طفلی کی حسین یادیں، لڑکپن کی شوخی شرارت، جوانی کے ایام اور عہد رفتگاں کے مٹتے نقوش شامل ہیں۔ امرتسر میں گزرے بچپن کے دنوں پر گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"۔۔۔ ہمارے گھر کے سامنے ایک ٹال تھی۔ ٹال والا موسیقی کا رسیا تھا۔ اس کی ٹال نہیں چلتی تھی مگر اس کا گانا خوب چلتا تھا۔۔۔ سحری کے اوقات میں ہماری گلی سے ایک سارنگی بجانے والا گزرتا تھا۔ سارنگی بجا کر سونے والوں کو جگاتا تھا۔"(۱)

مشتاق سات سمندر پار کی نئی معاشرت کی چمک دمک سے بے نیاز اپنے ماضی کی حسین یادوں میں گم سم دکھائی دیتے ہیں۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت نے ان کے جسم کا کوئی اہم حصہ ان سے الگ کر دیا ہو۔ وہ ماضی کے حسین منظروں سے آنکھ جھپکتے نہیں۔ جیسے ان کو ڈر ہو کہ کہیں یہ منظر بھی ان کی آنکھ سے اوجھل نہ ہو جائیں۔ گویا یہ منظر ان کی یاداشتوں میں جیتے جاگتے اور سانس لیتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کا ہر دن گزرے ہوئے لمحوں کی یاد میں کٹ جاتا ہے۔

آنکھ اٹھاتا ہوں تو ہٹ جاتے ہیں

دن ترے دھیان میں کٹ جاتے ہیں (۲)

لیکن جوں ہی دن ڈھلنے لگتا ہے تو یہ یادیں مزید تابناک ہو کر شفق میں گزرے زمانوں کے رنگ بکھیر دیتی ہیں۔ ان زمانوں میں رفتگاں کی خوشگوار یادیں انہیں مزید اداس کر دیتی ہیں۔ یہ اداسی کئی دنوں پر محیط ہوتی ہے۔ داخلی اور خارجی دنیائیں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ مشتاق کی شاعری میں داخلی کیفیت، خارجی صورت حال کو بھی ناگفتہ بنا دیتی ہے۔

شفق میں رنگ ہیں بیتے ہوئے زمانے کے

بہت اداس ہیں دن تیرے یاد آنے کے (۳)

اس حسین عہد کو بھلا دینا کوئی آسان کام نہیں۔ اگر کبھی کوشش کریں بھی تو ان کو وہ لوگ یاد آنے لگتے ہیں جن سے ان کے مراسم واجبی یا نفرت انگیز تھے۔ جو ان کے لئے مزید تکلیف کا سبب بنتے ہیں۔

کیسے انہیں بھلاؤں محبت جنہوں نے کی

مجھ کو تو وہ بھی یاد ہیں نفرت جنہوں نے کی (۴)

احمد مشتاق کی غزل میں کبھی کبھی رفتگاں کو بھولنے کی سعی بھی ملتی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہیں دوبارہ دیکھنے کی تمنا بھی سر اٹھاتی ہوئی دیکھی جاسکتی ہے۔ بھولنے کی اس کوشش میں ان کے داخل میں قنوطیت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں جو موسم خزاں کا سبب بنتے ہیں۔ لیکن اس مایوسی میں بہار کی تمنا بھی شامل ہے۔ اس بہار میں پھولوں پر رفتگاں کی یاد پھل پھول کی نئی شکل میں نمودار ہوتی ہے۔

میں تجھے بھول نہ جاتا تو خزاں ہی رہتی

شاخ پر پھول تری یاد دلانے آئے (۵)

ساقی فاروقی کی شاعری میں احمد مشتاق کی طرح دوہری ہجرت کا کرب موجود ہے۔ مغربی درہم ودینار پرست معاشرے میں ہجرت کے باوجود ان کی شاعری اپنے ادب ، کلچر اور رفتگاں کی یاد سے جڑی ہوئی ہے۔ رفتگاں کا ارتباط ماضی کی یادوں سے ہے۔ چونکہ ساقی فاروقی کی ابتدائی عمر کا بیشتر حصہ ہندوستانی اور پاکستانی معاشرے میں گزرا ہے۔ لہذا انہیں یہاں کے لوگوں سے فطرتاً رغبت ہے۔ تلاش معاش میں برطانیہ منتقلی کے باوجود ان کا ہندوستانی تہذیب وثقافت اور رفتگاں کی یادوں سے گہرا تعلق ہے۔ ان کی شاعری میں رفتگاں کی یادیں جانی دشمن بنی ہوئی دکھائی دیتی ہیں جو ان پر جان لیوا حد تک حملہ آور ہوتی ہیں۔ ساقی ان یادوں سے رقیب کی طرح پیش آتے ہیں اور دست وگریباں ہوتے ہیں۔ اس رقابت کے باوجود ان میں احباب سے ملنے کی خواہش سر اٹھاتی ہے۔ لیکن وہ اس رقیب سے ناروا سلوک رکھے ہوئے ہیں۔

اب اس کی یاد سے دشمن کی طرح ملتا ہوں

وہی طلب ہے مگر شعلگی بڑھا دی (۶)

باوجود اس کے پھر بھی وہ ٹکٹکی باندھے یادوں کے جزیروں میں بچھڑے ہوئے لوگوں کو تلاش کرتے ہیں۔ وہ خواہش کرتے ہیں کہ ایک جہاز رفتگاں سے لدا ہوا آئے۔ جس میں میرے دوست احباب سوار ہوں۔ وہ دوست احباب جو میرے دل ودماغ کے لیے مسرت وراحت کا سامان ہیں۔ چونکہ برطانوی معاشرت کے رنگارنگ ماحول میں بیگانگی اور تنہائی کا شدید احساس ہے۔ ایسے ماحول میں رفتگاں کی یاد آجانا غنیمت سے کم نہیں۔ یہ یادیں کسی حد تک دکھ کا مداوا کرتی ہیں۔

اک جہاز ادھر آئے اور کوئی اتر آئے

یاد کے جزیرے میں خواہشیں بہت سی ہیں (۷)

منصور آفاق کی شاعری نئے عہد کے پنپنے والے احساسات وجذبات اور دیارِ غیر کی نئی طرز معاشرت کی نمائندہ ہے۔ جدید زمانے کی لفظیات میں جدید انسان کی ترجمانی ان کے ہاں توانا انداز میں دکھائی دیتی ہے۔ دیارِ غیر بالخصوص برطانیہ کی تہذیب و معاشرت سے انہوں نے نہ صرف براہ راست اثر قبول کیا ہے بلکہ اس کا اظہار انگریزی لفاظی میں کر کے اردو شاعری کے دامن کو نئی نئی وسعتوں سے ہمکنار کیا ہے۔ یوں گلوبل ادب کی تشکیلات میں اپنا حصہ ڈالتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ برطانیہ میں قیام کے دوران انہوں نے وہاں کے سماج کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ اور یہ جلد بھانپ لیا کہ یہاں کی زندگی تیز رفتار ہے۔ انسان کے پاس وقت کی شدید قلت ہے۔ مادی آسائشوں اور زر کی خواہشوں نے انسان کو انسان سے دور کر دیا ہے۔ یہاں انسان شدید تن و تنہا ملتا ہے۔ بالخصوص مشرقی باشندہ وہاں کی طرزِ معاشرت میں گھل مل نہیں پاتا۔ زمانے کی رفتار سے جب قدم سے قدم نہیں ملا پاتا تو اپنے وطن اور اپنے دوست احباب کی یادوں میں گم دکھائی دیتا ہے۔ ایسا گم کہ گھنٹوں خاموشی چھائی رہتی ہے اور سکتہ طاری رہتا ہے۔ یہ ایسا سکتہ ہے جس میں بہرا پن شامل ہو جاتا ہے۔ جس میں انسان ماحول سے کٹ جاتا ہے۔ اور تصور میں یاد کی تصویر گفتگو کرنے لگتی ہے۔

گنگ بیٹھا ہوا ہوں پہروں سے

ایک تصویر گفتنی اور میں (۸)

وہ نئے سماج میں اپنی تہذیب و ثقافت کو نہیں بھولے۔ جب مذکورہ بالا یادیں ان کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ وہ ان خوشگوار یادوں کے باعث اشک بار ہوتے ہیں۔ اس اشک باری میں وہ اپنے ساتھ نیلگوں آسمان کو بھی شامل کر لیتے ہیں۔ گویا یہ دکھ درد صرف ان کا نہیں بلکہ پوری کائنات کا دکھ درد محسوس ہوتا ہے ان کی اشک باری میں تہذیبی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ مشرقی لوگ دکھ درد میں ایک دوسرے کے ساتھ مل بیٹھ کر سینہ کوبی کرتے ہیں۔ منصور آفاق تنہا رونے کے عادی نہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ اس یاد میں اکیلے نہیں سلگتے۔

اک آگ لگا دیتے ہیں برسات کے دل میں

ہم لوگ سلگتے نہیں تنہا اسے کہنا (۹)

۲۔ ہجرت کا کرب:

احمد مشتاق کا شمار ان شعراء میں ہوتا ہے جو ہجرت کے کرب سے بارِ دگر گزرے ہیں۔ تقسیم ہند کا سانحہ ایک ہولناک سانحہ تھا جس کو بھولنا ناممکن تھا۔ قیام پاکستان کے وقت ہونے والے فسادات نے طول پکڑا، جو بعد میں

خونریزی کا سبب بنا۔ ہجرت کے دوران مسلمانوں کو مختلف النوع کی تکالیف کو برداشت کرنا پڑا۔ اس ہجرت کے دوران مسلمانوں کے مال و متاع کو ہندواور سکھوں نے مل جل کر لوٹا۔ دوران مسافت مسافروں کی عصمتوں کو تار تار کیا گیا۔ مسلمان بچوں، بزرگوں اور عورتوں کا قتل عام کیا گیا۔ جس نے بدلے کی آگ کو ہوا دی۔ مذہبی بنیادوں پر ہونے والی ہجرت دراصل جغرافیائی ہجرت کے سوا کچھ نہ تھی۔ اس ہجرت کے حوالے سے احمد مشتاق رقمطراز ہیں:

> ”ہجرت وجرت نہیں تھی، بس وہاں فساد ہوئے تو بھاگ کر آ گئے اس کو ہجرت تھوڑی کہتے ہیں۔ لوگوں نے تو آتے ہوئے اپنی چیزیں بھی نہیں اٹھائیں کہ جب فساد ختم ہو جائیں گے تو واپس آ جائیں گے۔ لوگوں کو تو یہ بتایا ہی نہیں گیا کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے، لوگوں کو اندھیرے میں رکھا گیا۔ لوگ اس کے بعد بھی آتے رہے اور ویسے بھی اقبال کہتے ہیں: مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا، اس سے کیا ہوتا ہے کہیں بھی رہیں۔“(۱۰)

ہجرت کے وقت ان کا خاندان بھی امر تسر کو چھوڑ کر لاہور میں آ کر آباد ہوا۔ امر تسر سے ان کی عہدِ طفلی کی حسین یادیں وابستہ ہیں لیکن افتادِ زمانہ نے ان سے سب کچھ چھین لیا۔ پاکستان بننے کے بعد انہوں نے جس مثالی ریاست کا خواب آنکھوں میں سجایا ہوا تھا۔ وہ بری طرح سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوا۔ جس کی کرچیاں حال سے بیزاری کی صورت میں جلوہ گر ہوئی۔ اس بیزاری نے ان کی شاعری میں ناسٹلجیا کو پیدا کیا۔

خالی شاخیں بلا رہی ہیں
پھولو آؤ کہاں گئے ہو (۱۱)

احمد مشتاق ہجرت کے وقت ہونے والے حوادث پر نوحہ کناں ہیں۔ ہجرت سے پیدا ہونے والے داخلی انہدام نے ان کی شاعری میں ایک ایسے المیے کو پیدا کیا ہے۔ جو ان کے ہمعصروں میں ناصر کاظمی کے علاوہ کسی اور شاعر کے ہاں دکھائی نہیں دیتا۔ مذکورہ بالا شعر کے بارے ناصر کاظمی رقمطراز ہیں: ”یہ شعر ان ماؤں کا نوحہ ہے جن کی گودیں خالی ہو گئیں۔“(۱۲)

ان فسادات میں راہزانوں کے ہاتھ مسافروں کے مال و متاع کے لٹنے سے زیادہ احساس و جذبات کے لٹ جانے کا احساس ہوتا ہے۔ یہ مسافر غریب الدیار تھے۔ ایسے غریب الدیار کہ جو ایک بہتر مستقبل کے خواہاں تھے۔

اجنبی راہزنوں نے لوٹ لیے
کچھ مسافر تیرے دیار سے دور (۱۳)

تقسیم ہند نفسیاتی حوالے سے دیر پا اثرات لیے ہوئی تھی۔ اس کے نتیجے میں ہونے والی ہجرت سے لوگ اب تک ذہنی طور پر نکل نہیں سکے۔ جس مثالی ریاست کا خواب انہوں نے آنکھوں میں سجایا ہوا تھا اس خواب کو کسی کی نظر بد کھا گئی تھی۔ گویا ایک ایسی آندھی چلی تھی جس نے خواب کے باغ کا باغ الٹ پلٹ کر رکھ دیا تھا۔ شاخوں اور ٹہنیوں پر امید کے پھول پھل تک باقی نہ بچے۔ گویا ایک مکمل ناامیدی کی لہر دوڑ پڑی تھی۔ جس نے سوائے مایوسی کے انہیں اور کچھ نہ دیا۔ پوری نسل بے سمتی کے سفر پر رواں دواں دکھائی دینے لگی تھی۔

کس کی نگاہ کھا گئی، کون ہوا اڑا گئی

خواب کی ٹہنیوں کے پھول، پھول کی ٹہنیوں کے خواب (۱۴)

ساٹھ کی دہائی میں پاکستان سے لوگوں کی ایک بڑی تعداد نے بہتر مستقبل کے لیے دیارِ غیر کا رخ کیا۔ غریب الدیار ہونے کی مختلف محرکات تھے جن میں نمایاں محرک معاشی آسودگی اور ایک بہترین زندگی جینا تھا۔ احمد مشتاق نے معاشی آسودگی کے سبب دوہری ہجرت نوئے کی دہائی میں کی۔ یہ ہجرت بھی ان کے سفر کی ایک کڑی تھی۔ یہ سفر بھی ان کے لیے مصائب کے پہاڑ توڑ لایا۔ وہ بہترین ملک میں نقل مکانی کے باوجود اپنے حالات کے نہ سنوارنے پر افسردہ ہیں۔

وطن بدلا مگر بدلے نہ حالات

وہی دنیا وہی اس کے سوالات

وہی بپھرا ہوا بکھرا ہوا دن

وہی سہمی ہوئی سمٹی ہوئی رات

کبھی یہ کہہ کے دیتا ہوں تسلی

سحر ہوگی بدل جائیں گے حالات (۱۵)

بر صغیر کے مسلمانوں نے ایک یوٹوپیا ریاست کا خواب آنکھوں میں سجا کر ہندوستان کے مختلف علاقوں سے پاکستان کی سمت ہجرت کی تھی۔ جس میں انہوں نے ہزاروں قربانیوں کا نذرانہ پیش کیا۔ ان مہاجرین میں ایک رئیس کنبہ ساقی فاروقی کا بھی تھا۔ جس نے ہجرت کے دوران اپنا سب کچھ لٹایا۔ اس کنبے نے بنگلہ دیش اور پھر پاکستان میں کراچی شہر کو اپنا مسکن بنایا۔ ان سالوں میں انہیں معاشی طور پر بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ ایسے حالات

میں ساقی فاروقی نے ایک بار پھر ہجرت کی ٹھانی۔ لیکن اب کہ ہجرت کے محرکات میں بہتر معاش اور بہتر سوسائٹی کی تلاش شامل تھی۔ جس کا رستہ بھی پر خار اور سنگلاخ تھا۔

راہ میں چھاؤں ملی تھی کہ ٹھہر سکتے تھے

اس سہارے کو مگر زخمِ سفر جانا تھا(۱۶)

انسانی تاریخ میں ہجرت کا کرب انسانی تخلیق کے ساتھ ہی شروع ہوا۔ جب باغِ عدن سے انسان کو نکال کر روحِ زمیں پر بھیجا گیا۔ گویا ہجرت انسان کا ازل سے مقدر ٹھہری۔ ہجرت کا عمل بذاتِ خود تکلیف دہ عمل ہے۔ منصور آفاق کی شاعری میں انسان کی ازلی ہجرت کے کرب سے لے کر عہد حاضرہ کی بیرونی ہجرتوں کا کرب شامل ہے۔ ہجرت عموماً آبائی علاقوں کے حالات وواقعات کی ناسازی کے تحت کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اہل زمیں کے حالات پر افسردہ دکھائی دیتے ہیں۔ ان حالات میں ان کی شاعری میں ناسٹلجیائی رنگ در آیا ہے۔ افسردگی نے ان کے لاشعور میں باغ عدن کی دلکش یادوں کے در وا کیے ہیں۔

میں آسماں نژاد زمیں پر مقیم ہوں

کچھ ہے یہاں کا درد تو کچھ ہے وہاں کی یاد(۱۷)

پاکستان سے ہجرت کرنے والے تارکین میں ایک بڑی تعداد بیرون ممالک میں مختلف ذرائع سے شارٹ کٹ راستہ اختیار کرنے والوں کی ہے۔ یورپین ممالک میں برطانیہ اس حوالے سے تارکین وطن کی اول ترجیحی ہوتی ہے۔ وہ لاکھوں روپے ایجنٹوں کو دے کر سمندر کے راستے ڈنکی کے ذریعے دیارِ غیر کا پر خطر راستہ اختیار کرتے ہیں۔ اس میں ایک بڑی تعداد ان لوگوں کی ہوتی ہے جو مڈل کلاس سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے پورے پورے کنبوں کو سستے داموں ترقی یافتہ ممالک میں منتقل کرنا چاہتے ہیں۔ ان سب کا مقصد روشن مستقبل ہے۔

عالمی سطح پر اس کو انسانی سمگلنگ قرار دیا گیا ہے۔ باوجود اس کے لوگ موت کو سینے لگانے سے باز نہیں آتے۔ منصور آفاق نے تارکین وطن کے اس کربناک سفر کے احوال کو ایسے شعر میں بیاں کیا ہے، گویا کشتی میں سوار لوگ، ساحل کی تمنا میں گرداب کی نذر ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ اور ان کی چیخ و پکار سننے والا کوئی ناخدا تو ناخدا، خدا تک نہیں ہوتا۔ شاعر افسوس تو اس بات کا کرتے ہیں کہ انتہائی دردناک سفر میں لاکھ مصائب برداشت کرنے کے باوجود یہ لوگ جب ساحل کے بلکل قریب پہنچتے ہیں تو ان کو کشتی حادثہ پیش آتا ہے۔

لوگ مرتے جا رہے تھے ساحلوں کی آس پر

ناؤ آتی جا رہی تھی پانیوں کے جال میں (۱۸)

بیرونی ہجرتوں کا سب سے نمائندہ محرک معاشی آسودگی ہی ہے۔ وگرنہ اپنے لوگوں سے کون دوری اختیار کرتا ہے۔ دیارِ غیر میں معاشی آسودگی تو حاصل ہو جاتی ہے لیکن اپنوں سے جدائی ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ ہجرت کا کرب ایک تکلیف دہ عمل ہے۔ علی ارمان کی شاعری میں "گھر" کا استعارہ وطن کے طور پر برتا گیا ہے۔ جبکہ "شام" کا استعارہ زوال کے لیے برتا گیا ہے۔ یعنی وطن کے حالات جب ابتر ہوئے تو ہجرت کی ٹھانی گئی یہ ہجرت اختیاری ہونے کے ساتھ وقت کا جبر بھی معلوم ہوتی ہے۔ جبکہ "پرندوں" کا استعارہ ان لوگوں کے لیے برتا گیا جو ان کے بزرگ یا خیر خواہ ہیں۔ دیارِ غیر منتقلی کے بعد انہیں وہ خیر خواہ لوگ شدت سے یاد آ رہے ہیں جو اس ہجرت سے انہیں روک رہے تھے۔

قدم قدم پر روکا مجھے پرندوں نے

میں جب اپنے گھر سے نکلا شام ڈھلے (۱۹)

۳۔ تشخص کی تلاش:

آغاز سے ہی انسان تشخص کا متلاشی رہا ہے۔ وہ اپنی کھوج لگانا چاہتا ہے کہ وہ کون ہے؟ کیا ہے؟ وہ اسی تجسس میں عمر بسر کرتا ہے کہ ایک دن اپنے بارے میں آگاہی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ مادی آسائشوں کے حصول کے لیے دیارِ غیر میں ہجرت کرنے والے تارکینِ وطن نئی معاشرت میں قدم سے قدم نہیں ملا پاتے۔ ایسے میں وہ احساسِ محرومی کا نہ صرف شکار ہوتے ہیں بلکہ تشخص کی تلاش میں سرگرداں دکھائی دیتے ہیں۔ تارکینِ وطن کی ایک بڑی تعداد گزشتہ چند دہائیوں سے یورپین ممالک کا رخ کر رہی ہے۔ جہاں کی نئی فضا میں انہیں بہت سے مسائل کا سامنا ہے۔ وہی ایک مسئلہ تشخص کا ہے۔ یہ ہجرت جغرافیائی ہی نہیں بلکہ جذباتی سطح پر فرد کی تنہائی اور اداسی میں اضافے کا سبب بنی ہے۔ جس سے نہ صرف گمشدہ زمانہ، تہذیب و تمدن، اخلاقی اقدار بلکہ ذات کی گمشدگی تک کی خبر ملتی ہے۔ جس کی کھوج فرد کو ماضی میں جھانکنے پر مجبور کرتی ہے۔

ڈاکٹر شیر علی رقمطراز ہیں۔

"مہاجرت کی زندگی انسان کو اس کی پہچان سے بھی محروم کر دیتی ہے۔ بچھڑنے کا یہ ایک لامتناہی عمل ہوتا ہے۔ جس میں انسان اپنی مٹی اور دھرتی، اپنے دوستوں، رشتہ داروں سے بچھڑنے کے بعد صنعتی معاشرے میں خود اپنے تشخص سے بھی بچھڑ جاتا ہے۔" (۲۰)

اس صنعتی معاشرے میں انسان بھی مشین کا ایک پرزہ بن چکا ہے۔اس کے جذبات و احساسات بلکل مانند پڑ چکے ہیں۔وقت کی قلت نے انسانی تعامل میں کمی پیدا کر دی ہے۔وہ دوست احباب کو وقت نہیں دے پاتا۔جس سے شدید تنہائی پیدا ہو گئی ہے۔اس تنہائی میں وہ اپنی تلاش میں نکلتا ہے۔ایسے میں انسان اپنے ماضی کو کریدھتا ہے ۔تاکہ وہ اپنے آپ کو تلاش کر سکے۔ماضی میں اپنے آبائی وطن کو یاد کرتا ہے۔وہ آبائی وطن کو پلٹنا بھی چاہتا ہے لیکن وہاں کی زبوں حالی کو دیکھ کر چپ سادھ لیتا ہے۔

احمد مشتاق کی شاعری میں تشخص کی تلاش کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔نئے سماج کی نئی طرزِ معاشرت نے انہیں اس قدر تنہا کر دیا ہے کہ وہ اپنے ماضی کی بھول بھلیوں میں کھو کر گزرے ہوئے زمانے کے مٹتے نقوش میں ان گلی کوچوں، کچے پکے مکانوں، دوستوں یاروں، اور تہذیب و تمدن کو تلاش کرتے ہیں جو ان کی شناخت ہے۔ لیکن دیارِ غیر کی برق رفتار زندگی ان نقوش کو خواب و خیال بنا رہی ہے۔جس کا اظہار ان کی شاعری میں ملتا ہے۔

اب وہ گلیاں وہ مکاں یاد نہیں
کون رہتا تھا کہاں یاد نہیں
جلوہ حسن ازل تھے وہ دیار
جن کے اب نام و نشاں یاد نہیں
کوئی اجلا سا بھلا سا گھر تھا
کس کو دیکھا تھا وہاں یاد نہیں
یاد ہے زینہ پیچاں اس کا
در و دیوار مکاں یاد نہیں (۲۱)

خواہشوں اور آسائشوں کے لیے کی جانے والی ہجرت نے شاعر کو دربدر کر دیا۔ تہذیب و ثقافت کے نقوش کو مٹانے کے علاوہ اس سفاک معاشرت نے اس کی انفرادی شناخت کو بھی مسخ کر دیا۔اس مسخ شدہ شناخت میں وہ اپنے چہرے کو بھی پہچان نہیں پا رہا۔ معاشی تعامل تو ایک طرف اس کا کئی کئی دن خود سے بھی رابطہ منقطع رہتا ہے۔

گم ہوئے یوں غبارِ ہستی میں
ہم کو اپنی خبر نہیں آتی (۲۲)

ساقی فاروقی کی شاعری میں تشخص کی تلاش ایک بنیادی مسئلہ دکھائی دیتا ہے۔ جس کے پس منظر میں بہت سے عناصر کار فرما ہیں۔ مغربی ماحول میں گھل مل جانے کے باوجود ان کی شاعری مشرقی تہذیب وثقافت کا آئینہ دار معلوم ہوتی ہے ۔ لیکن جب وہ تشخص کی تلاش میں بھٹکتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں تو مذہبی اخلاقیات ،معاشرتی معیارات اور اصول وضوابط سب کو روندتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔

جمال پانی پتی رقمطراز ہیں:"وہ کسی چیز کی اچھائی یا برائی کا فیصلہ اخلاقی معیارات کی رو سے نہیں کرتا بلکہ ہر چیز کو خود اپنے تجربے کی کسوٹی پر پرکھ کر قبول یا رد کرتا ہے۔"(۲۳)

یہ تجربہ گاہ ان کی ذات میں پنہاں ہے۔وہ ہر کھرے کھوٹے کو اس تجربہ گاہ سے گزار کر پرکھتے ہیں۔ وہ حلال اور حرام کے معیارات کو توڑنا چاہتے ہیں۔ مغربی تہذیب اپنا کر میخانوں میں شراب نوشی اور ساحلوں کی ریت پر برہنہ گھومتے پھرتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اپنا سراغ لگانے میں ناکام دکھائی دیتے ہیں۔اس تلاش کے سفر میں ایک ایسی ہوا چلی ہے کہ جس نے انہیں سب کچھ بھولا دیا ہے۔وہ دوسروں کو تاکید کرتے ہیں کہ انہیں تلاش کر کے لایا جائے اوران کا نام پتا ان کو بتایا جائے۔

بادِنسیاں ہے مرا نام بتادو کوئی

ڈھونڈ کر لاؤ مجھے مرا پتا دو کوئی (۲۴)

خود کو ڈھونڈنے کی جستجو میں جہاں ہر ایک پیمانہ توڑتے ہوئے چلے جاتے ہیں اور دوسروں کو اپنی تلاش کی تاکید کرتے ہیں وہی اپنے تعاقب میں خود بھی نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ وہ تلاش کا سفر ہے جو تمام نہیں ہوتا۔وہ اس بات کا باخوبی ادراک رکھتے ہیں کہ تلاش کا یہ سفر نئی تھکن ،کاندھوں پر لاد کر پلٹنے کے سوا کچھ حاصل نہیں۔

میں بھی لوٹ آؤں گا اپنے تعاقب سے

تم بھی مجھ کو ڈھونڈ کے تھک جانا اک دن (۲۵)

مذکورہ بالا پیراگراف میں جیسے کہا گیا ہے کہ انسان کا ازل سے ابد تک کا سفر کیا، کیسے اور کب کی کھوج میں طے ہوتا ہے۔ وہ آغاز ہی سے جاننا چاہتا ہے کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ کس مقصد کے لیے آیا ہے؟ اور اسے کہاں لوٹ کر جانا ہے؟ وہ ایک مسافر کی طرح زندگی بسر کرتا ہے۔اس کا یوں دربدر بھٹکنا بے سود نہیں ہوتا بلکہ اس کی یہ مسافری اپنے ہونا کا جواز ڈھونڈتی ہے۔ منصور آفاق اس بے گھری اور مسافری میں اپنے تشخص کو تلاش کرتے ہیں۔

اپنی اپنی تلاش میں گم ہیں

عمر بھر کی مسافری اور میں [۲۶]

انسان جب اپنی تلاش میں نکلتا ہے تو اسے ملکوں ملکوں کی گرد چھاننی پڑتی ہے۔ ایک طویل مسافرت کے بعد جب وہ اپنی کھوج لگانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ شعورِ ذات کو حاصل کرنے کے لیے اسے اپنے ماضی کے اندر جھانکنا پڑے گا۔ لیکن اس میں داخل ہونے والے دروازے کو دیمک چھاٹ چکی ہے۔ جس سے گزرنا اب آسان نہیں۔ اگر اس مکان میں داخل ہو بھی جائیں تو اس مکان کی چھتوں کے ساتھ حسین یادوں کے جالے لگے ہوتے ہیں۔

مکانِ ذات کے دیمک زدہ کواڑ کھلے

بھری ہوئی ہیں چھتیں مکڑیوں کے جالوں سے [۲۷]

صنعتی ترقی نے انسان کی انفرادیت ختم کر دی ہے۔ انفرادیت کی جگہ اجتماعیت نے لے لی ہے۔ دیہات کلچر مفقود ہو کر رہ گیا ہے۔ لوگوں کی ایک بڑی تعداد نے شہروں، بہترین سوسائٹیوں اور ممالک کا رخ کیا ہے۔ جہاں انسان نے معیارِ زندگی کو بہتر کر لیا ہے وہی شناخت کے مسائل نے سر اٹھا لیا ہے۔ علی ارمان کی شاعری میں شہر اور گاؤں کے استعاروں کی مدد سے ایک ایسی تہذیب کی کھوج لگائی گئی ہے۔ جہاں انسان کی پہچان ہوتی ہے۔ چھوٹے بڑے ہر ایک کی اپنی شناخت ہوتی ہے۔ لیکن شہر کی بھیڑ بھاڑ میں انفرادیت ختم ہو گئی ہے۔

گاؤں کے پیڑ بھی پہچان لیا کرتے تھے

شہر کی بھیڑ میں کھوئے ہیں تو یاد آیا ہے [۲۸]

۴۔ خوشگوار لمحات کی تلاش:

نامساعد حالات کے پیشِ نظر لمحہِ موجود سے بیزاری فرد کو ناسٹلجیا کا شکار بنا دیتی ہے۔ جس میں فرد ماضی میں جھانک کر ایسے لمحات تلاش کرتا ہے جو اسے نشاط و سکون دے سکیں۔ پاکستانی تارکینِ وطن کی ایک بڑی تعداد ساٹھ کی دہائی سے اب تک دیارِ غیر بالخصوص مغربی ممالک میں مختلف وجوہات کی بنا پر ہجرت کرتی آ رہی ہے۔ جہاں کی بہترین معاشرت میں پہنچنے کے بعد بھی وہاں کی آسائشیں انہیں راحت و سکون نہیں دے پاتیں۔ جس کی وجہ سے وہ اپنے آبائی وطن میں گزرے ایام کی یاد میں ماضی میں پناہ گزین ہوتے ہیں۔

تارکین وطن شعراء کی شاعری میں جہاں ناسٹلجیا کے دیگر کیفیات کا اظہار ملتا ہے۔ وہی خوشگوار لمحات کی تلاش کا پہلو نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ احمد مشتاق کی شاعری میں اس جذبے کا اظہار پوری آب و تاب سے ملتا ہے۔ یہ جذبہ اس وقت شدت اختیار کرتا ہے جب وہاں کی طرز معاشرت میں میسر آسائشیں مادی ضروریات کو تو پورا کرتی ہیں لیکن روح کی پیاس کو بجھانے میں ناکام ثابت ہوتی ہیں۔ وہ قلب وروح کی تسکین کے لیے ماضی کی کھڑکی کو کھولتے ہیں۔ جہاں کی تازہ ہوا میں یادوں کے خشک پتے اڑنے لگتے ہیں۔ انہی پتوں میں وہ اس بہار کا سراغ لگاتے ہیں جو خوشگوار لمحات سے بھرپور ہے۔ یہ لمحات ان کے قلب وروح کو ایسا سکون دیتے ہیں جو ناقابل بیان ہیں۔

کوئی ڈھونڈو کوئی سراغ لگاؤ

انہیں پتوں میں چھپ گئی ہے بہار (۲۹)

یہ تلاش کسی مخصوص مقام پر ختم نہیں ہوتی بلکہ انہیں قریہ قریہ، نگر نگر لیے پھرتی ہے۔ اس دربدری میں ان کے دل کو ایک اعتماد حاصل ہوتا ہے کہ اس جہانِ خراب میں ایک نہ ایک دن تلاش اختتام پذیر ہو گی۔ اور انہیں وہ خوشگوار لمحے میسر آئیں گے جو ماضی کی حسین داستان بن چکے ہیں۔

مل ہی جائے گا کبھی دل کو یقیں رہتا ہے

وہ اسی شہر کی گلیوں میں کہیں رہتا ہے (۳۰)

اگر کبھی اس تلاش کے دوران وہ تھک ہار کر پل دو پل کے لیے آنکھ لگاتے بھی ہیں تو یہ سفر ختم نہیں ہوتا۔ وہ خواب گاہوں میں بھی یاد کی مشعلیں تھامے اس حسین خواب کو تلاشتے ہیں جس نے ایک عمر اُن کو سونے نہیں دیا۔

نیندوں میں پھر رہا ہوں اسے ڈھونڈھتا ہوا

شامل جو ایک خواب مرے رتجگے میں تھا (۳۱)

منصور آفاق کی شاعری میں عمر گزشتہ کی حسین یادوں کی تلاش کا ایک لامتناہی سلسلہ دکھائی دیتا ہے۔ وہ ایک مدت سے خوشگوار لمحات کی تلاش کو اپنا مشغلہ بنائے ہوئے ہیں۔ ان کا لمحہ لمحہ اسی مشغلے میں صرف ہوتا ہے۔ وہ اس معاملے میں پر امید اور پر اعتماد دکھائی دیتے ہیں کہ ایک نہ ایک دن عمر گزشتہ کی طرح خوبصورت دن لوٹ آئیں گے۔ انہوں نے خوابوں اور آسائشوں کی تلاش میں برطانیہ کو اپنا مسکن تو بنایا ہے۔ لیکن حقیقتاً یہ خوابوں کی دنیا ان کے لیے ناخوشگواری کا سبب بنی ہے۔ وہ انہی خواہشوں اور خوابوں بھری دنیا کے آس پاس تھک کر سو گئے ہیں۔

اچھے دنوں کی آس میں کتنے برس ہوئے

خوابوں کے آس پاس کہیں سو رہا ہوں میں (۳۲)

گزرے ہوئے لمحے ان کے حواس پر چھائے ہوئے ہیں۔ ایک کھٹکا سا ان کے دل و دماغ اور سماعت کو لگا رہتا ہے۔ اس نیند میں ان کو کبھی کبھی اپنے گزرے ہوئے زمانے کے قدموں کی چھاپ سنائی دیتی ہے۔ وہ لمحہ بر کے لیے اس آہٹ پر چونک اٹھتے ہیں اور بیدار ہو جاتے ہیں۔ جب بیداری کے بعد ارد گرد نگاہ دوڑاتے ہیں تو ان کو حال کی تلخیوں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

اس کے پاؤں کی چاپ تھی شاید

یا یونہی کان میں بجا کچھ تھا (۳۳)

پاکستانی تارکین وطن کا دن دیارِ غیر میں مصروفیات میں صرف ہو جاتا ہے۔ لیکن شام ڈھلے ہی شدید تنہائی دل و دماغ کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ اس تنہائی میں اپنوں کی کمی کا شدید احساس ہوتا ہے۔ وہ ان دنوں کو یاد کرتا ہے جب اس کے اپنے اس کے پاس تھے۔ وہ ان کی یاد میں سوائے گریہ زاری کے اور کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ لیکن سحر ہوتے ہی ان حسین دنوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اس کی ہر صبح کا آغاز خوشگوار دنوں کی تلاش سے ہوتا ہے جو شام ڈھلے رونے دھونے پر ختم ہوتا ہے۔

میری ہر شام کا آغاز تجھے روتا ہے

میرے ہر دن کی شروعات تجھے ڈھونڈتی ہے (۳۴)

۵۔ حالات وواقعات کی تلخیاں:

قیام پاکستان سے اب تک ملکی حالات کوئی تسلی بخش دکھائی نہیں دیے۔ تقسیم ہند کے وقت ہونے والے فسادات، ہجرت کا کرب، ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ، ۱۹۷۱ء میں سانحہ بنگال، چار مختلف فوجی مارشل لاء، سول حکومتوں کا ٹوٹنا اور بننا، صدرِ پاکستان کا اسمبلیاں تحلیل کرنا، غیر ملکی جنگ میں شرکت کے نتائج، نائن الیون کے بعد مشرقِ وسطہ کے خطوں میں دہشت گردی اور ملکی سیاسی عدم استحکام کی فضا، بالخصوص معاشی صورت حال نے ایسے نامساعد حالات وواقعات کو جنم دیا ہے۔ جس کی وجہ سے تارکینِ وطن جوق در جوق غیر ملکی ریاستوں کی سمت نقل مکانی اختیار کرنے لگے ہیں۔ موجودہ حالات میں معاشی صورت حال کے پیشِ نظر نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد تعلیم

کے حصول کے لیے سٹڈی ویزہ اور بزنس ویزہ کو حاصل کر رہے ہیں اور دیارِ غیر بالخصوص برطانیہ کا رُخ کر رہے ہیں۔ جس کے پس پردہ وہاں کی بہتر زندگی میں مستقل قیام پذیر ہونا جیسے محرک شامل ہیں۔

دیارِ غیر منتقلی کے بعد تارکین وطن کو کئی ایک مسائل سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ وہاں کے سماج میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے وہاں کی تہذیب و ثقافت، مذہب، اخلاقی اقدار، زبان و بیان جیسے چیلنجز کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مغربی ممالک میں مشترکہ خاندانی نظام نہ ہونے کی وجہ تمام مصائب و آلام انفرادی طور پر فرد کو برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ جس میں فرد شدید تنہائی کو محسوس کرتا ہے۔ یہ تنہائی ناسٹلجیا کی صورت میں وقوع پذیر ہوتی ہے۔

اردو شاعری میں جہاں دیگر مضامین کو موضوع بنایا جاتا رہا ہے وہی دو بڑے موضوع غمِ جاناں اور غمِ دوراں کا تذکرہ بھی ملتا آیا ہے۔ تقریبا تمام شعراء نے ان موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔ ملکی حالات کے پیشِ نظر دیار غیر منتقل ہونے والے تارکینِ وطن شعراء کی شاعری میں غمِ جاناں سے زیادہ غمِ دوراں کا نوحہ ملتا ہے۔ انہی شعراء میں احمد مشتاق بھی شامل ہیں۔ ان کی شاعری میں مغرب کی بہترین معاشرت اور بہترین معاشی انفرسٹکچر میں صورت حالات نہ بدلنے کا دکھ شامل ہے۔

انتظار حسین رقمطراز ہیں: "مشتاق نے زندگی میں کارِ دنیا سے تو بے شک اپنے آپ کو دور رکھا۔ مگر غمِ دوراں تو اس کے یہاں وافر مقدار میں موجود ہے۔"(۳۵) وطنِ عزیز میں عموما لوگوں میں مغربی ممالک منتقل ہونے والے تارکین وطن کے بارے میں یہ قیاس آرائی ملتی ہے کہ وہ زندگی کی بہترین سہولیات سے آراستہ ہونے کے ساتھ ساتھ کم محنت کے عوض وافر مقدار میں سرمایہ حاصل کرتے ہیں۔ انہیں ان حالات وواقعات کا سامنا نہیں کرنا پڑتا جو محبِ وطن کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ لیکن یہ محض قیاس آرائی ہے۔ تارکینِ وطن نے پاکستان کے حالات وواقعات کی تلخیوں سے تنگ آ کر دیارِ غیر کی سمت ہجرت کی تھی تاکہ وہاں حالات کچھ بہتر ہو سکیں۔ لیکن کم بختی یہ ہوئی کہ وہاں کے حالات بھی ان کے لیے سازگار ثابت نہ ہوئے۔

تبدیلی حالات کے چرچے تو بہت ہیں
لیکن وہی حالات کی صورت ہے ابھی تک(۳۶)

وہاں کی زندگی مصروف ہونے کے ساتھ اپنے ساتھ گوناگوں مصائب و آلام رکھتی ہے۔ یہ مصائب آلام فرد کو اپنے گھیرے میں رکھتے ہیں جس سے جان چھڑانا ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ ایسے حالات واقعات میں وطنِ عزیز کے لوگوں کی خبر ملنا تو دور کی بات ہے کئی کئی دن اسے اپنا بھی ہوش نہیں ہوتا۔ مشتاق ایسے میں اپنے لوگوں سے

شکوہ کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کہ ہم تو گردشِ حالات کے سبب وقت کے منظر نامے سے روپوش ہیں۔ لیکن احباب کو کون سی مصیبت آن پڑی ہے کہ انہوں نے کبھی خبر تک نہیں لی۔

کچھ تم کہو تم نے کہاں گزارے روز و شب

اپنے نہ ملنے کا سبب تو گردش حالات تھی (۳۷)

تم کہو کیا تھا تمہاری کم نمائی کا سبب

مجھ کو تو یہ پاؤں کا چکر لیے پھرتا رہا (۳۸)

ساقی فاروقی نے عمر کے سینتیس سال ہندوستان میں گزارے ہیں۔ جہاں انہوں نے حالات وواقعات کی تلخیوں کو نہ صرف برداشت کیا ہے بلکہ اس زہر کو پیا بھی ہے۔ انہی تلخیوں کے نتیجے میں آزادی کے نام پر ایک بڑے پیمانے پر ہجرت ہوئی ۔اس ہجرت میں جہاں ہزاروں گھروں نے نقل مکانی کی ۔وہی ساقی کا کنبہ بھی شامل تھا۔ انہوں نے دوران ہجرت بہت سی تکلیفوں کا سامنا بھی کیا۔ پہلے بنگلہ دیش تو پھر پاکستان کو اپنا مسکن بنایا۔ پاکستان کے حالات بھی ان کے لیے ساز گار ثابت نہ ہوئے۔ ملکی حالات اور تلاش معاش میں ایک بار پھر سے بہتر زندگی کے خواب آنکھوں میں سجائے مغرب کی راہ لی۔ جہاں انہوں نے برطانیہ میں سکونت اختیار کی۔ انہیں لگتا تھا کہ اس ترقی یافتہ ملک میں منتقل ہو جانے کے بعد ان کے حالات کسی حد تک سنور جائیں گے۔ لیکن برطانیہ منتقلی کے باوجود ان کے حالات وواقعات سنورتے ہوئے دکھائی نہیں دیتے۔

یوں دل میں اٹھی لہر، یوں آنکھوں میں بھرے رنگ

جیسے مرے حالات سنور جائیں گے اک دن (۳۹)

روزِاول سے پاکستان کے حالات کوئی تسلی بخش دکھائی نہیں دیے۔ اسے نالائق قیادتوں نے اس دہانے پر لا چھوڑا ہے جہاں عالمی دنیا سے مقابلہ دیوانے کا خواب معلوم ہوتا ہے۔ پاکستان میں متوسط طبقے کا جینا دوبھر کر دیا گیا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ معشیت اس قدر مضبوط تھی کہ ایک شخص کماتا تھا اور دس کھایا کرتے تھے۔ لیکن موجودہ حالات میں دس کمانے والے ہیں اور ایک شخص بھی کھانے والا نہیں ہوتا۔ ملک میں نوکریاں اور ذرائع معاش نہ ہونے کے برابر ہیں۔ آئے دن ملک میں قیمتوں کا اتار چڑاؤ بے روز گاری میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔ منصور آفاق دیارِ غیر میں آباد ان تارکین کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں جو ملکی حالات پر کراہتے ہیں۔ ملکی فراق کے باوجود

ملکی حالات سنوارنے کا نام نہیں لیتے۔ تارکینِ وطن لاکھوں روپے کما کر پاکستان بھیجتے ہیں لیکن کرنسی پھر بھی آئے دن سنبھلنے کا نام نہیں لے رہی۔

باندھ کے رکھتا ہوں مضبوط گرہ میں لیکن
پاکستانی نوٹ کی قیمت گر جاتی ہے (۴۰)

جب کسی ملک میں معاشی نظام مضبوط نہیں ہوتا تو وہاں مختلف النوع کے مسائل جنم لیتے ہیں۔ کرپشن ،لوٹ مار، چور بازاری، بدامنی اور قتل وغارت کا بازار گرم ہوتا ہے۔ ملک میں غیر یقینی کی فضا پیدا ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے پاکستان ایک ایسی ہی ڈسٹوپیا ریاست کا تصور پیش کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ منصور ملکی حالات وواقعات کا بغور جائزہ لیتے ہوئے پاکستان کے حالات پر غیر اطمینانی کا اظہار کرتے ہوئے اسے کو دوزخ سے تشبیہ دیتے ہیں۔

تیز کراہیں، آہیں، چیخیں، گرمی اور سیلاب سانس عذاب
پاکستان کے منظر ہوں یا دوزخ کے حالات ایک ہی بات (۴۱)

زندگی کا نصاب ہر ایک کے لیے مختلف ہوتا ہے۔ یہ کانٹوں سے بھرا ہوا ایک ایسا رستا ہے جہاں سے دامن کو بچا کر گزرنا ناممکن ہے۔ گردشِ حالات انسان کو محلوں سے اٹھا کر فٹ پاتھوں پر بٹھا دیتے ہیں۔ لیکن اگر زندگی کا ہمسفر اچھا ہو تو زندگی سہل معلوم ہوتی ہے۔ حالات وواقعات کیسے ہی کیوں نہ ہوں۔ وہ ان سے مل جل کر نبرد آزما ہوتے ہیں۔ علی ارمان کی شاعری برطانیہ جیسی بہترین سوسائٹی میں حالات و واقعات کی تلخیوں پر نوحہ کناں ملتی ہے۔ یہ تلخیاں ان میں شدید قسم کا ناسٹلجیا پیدا کرتی ہیں۔ جس میں وہ اپنے ماضی کو یاد کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اس ماضی میں ان کا وہ بہترین ساتھی موجود تھا جو ہر طرح کے حالات میں ان کے ساتھ کھڑا ہوتا تھا۔ جس میں ہر طرح کے حالات سازگار معلوم ہوتے تھے۔ لیکن مغرب میں حالات وواقعات کی تلخیوں میں باوفا دوست نہیں ملتا۔ عموماً مشرقی کلچر میں ہمسفر ہر طرح کے حالات میں وفا کرتا ہے۔ لیکن مغربی کلچر میں ہمسفر مشکل حالات میں چھوڑ جاتے ہیں۔

جن دنوں تم بھی مرے ساتھ ہوا کرتے تھے
کتنے اچھے یہی حالات ہوا کرتے تھے (۴۲)

۶۔ ثقافتی وتہذیبی ورثے سے دوری:

ادب اور زندگی کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ہر قوم اپنی تہذیب وثقافت اپنی آئندہ نسلوں تک منتقل کرنے کے لیے ادب کا سہارا لیتی ہے۔ ادب میں تہذیب وثقافت کی بھرپور ترجمانی ملتی ہے۔ اگر کوئی معاشرہ

زوال پذیری کے دہانے پر کھڑا ہے تو لازم ہے کہ اس کی جھلک اس عہد کے ادب میں بھی ہو گی۔ جس کی ایک مثال مغلیہ سلطنت کے زوال کے دور میں تخلیق ہونے والے ادب ہے۔ اخلاقی اقدار اگر مضبوط نہ ہو تو قوم میں منافقت، ریاکاری تکبر اور خود غرضی جیسے جذبات عروج پاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے قوم منقسم ہو جاتی ہے۔ جبکہ اس کے بر عکس کسی قوم میں اخلاقی اقدار مضبوط ہو تو محبت اور خلوص جیسے جذبات پروان چڑھتے ہیں جس سے قوم میں اتحاد و یقین کی فضا پیدا ہوتی ہے۔ پاکستانی تارکینِ وطن کو دیارِ غیر میں مغربی طرزِ معاشرت میں ایک نئی تہذیب و ثقافت کا سامنا ہے۔ مشرقی اور مغربی تہذیب و ثقافت میں واضع فرق موجود ہے جس کو تارکینِ وطن شدت سے محسوس کرتے ہیں۔ اس معاشرے کی بنیاد مادیت پرستی ہے۔ جس سے عدم مطابقت گونا گوں مسائل کو جنم دیتی ہے۔ ان میں نفسیاتی، سماجی اور خانگی مسائل نمایاں ہیں۔ ان لوگوں میں سب سے بڑا اڈر اور خوف نئی نسل میں مذہب، زبان، تہذیب و ثقافت اور ارفع اقدار کی منتقلی ہے۔

گوپی چند نارنگ رقمطراز ہیں:

> "تقسیم ہند کے نتیجے میں ہوئی ہجرت ایک سیاسی جبر تھی۔ لیکن اس میں تہذیبی اجنبیت کا احساس زیادہ شدید نہ تھا۔ لیکن اس کے بر خلاف بر صغیر سے برطانیہ کی ہجرت کا عمل اپنی خواہش سے، تلاش معاش اور زندگی کو بہتر بنانے کے لیے تھا۔ لیکن ان مہاجرین میں سے اکثر کا اپنے وطن واپسی آنے کا تصور ختم ہو چکا تھا۔ چنانچہ یہ ہجرت صرف معاشی ہجرت نہ رہ کر، معاشرتی اور تہذیبی ہجرت بھی ثابت ہوئی۔ لہذا ان کی تہذیبی اجنبیت و غیریت کے تجربے زیادہ شدید تھے۔ اپنی جڑوں سے کٹ جانے اور اپنی تہذیبی سرچشموں سے محروم ہو جانے کا قلق زیادہ گہرا تھا۔"(۴۳)

ایسے ناگوار حالات میں ہر دوسرا شخص ناسٹلجیا کا شکار دکھائی دیتا ہے۔ وہ وطنِ عزیز میں واپس پلٹنا چاہتے ہیں لیکن یہاں کے معاشی حالات انہیں وہاں رہنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ادبا و شعراء باطنی زندگی میں اپنے اس ماضی کو تلاشتے ہیں جہاں کی تہذیب و ثقافت ان کا سرمایہ کل تھا۔ وہ اس سرمائے سے دوری کو محسوس کرتے ہیں۔

پاکستان سے ہجرت کرنے والے تارکینِ وطن نئی طرز معاشرت میں اپنی اقدار سے انحراف کر کے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس نئے معاشرت کے بود و باش کو اپنانے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن جب یہ اس کوشش میں ناکام ہوتے ہیں تو ان کے ہاں ماضی میں اپنی روشن اقدار اور ثقافت میں پناہ لینے کے سوا

کوئی اور چارہ نہیں بچتا۔ یورپین معاشرے مادی طرزِ معاشرت میں جیتے ہیں۔ جہاں نام و نسب کی کوئی اہمیت نہیں بلکہ کمپنی اپنی شناخت رکھتی ہے۔ افراد کمپنی کے نام سے ہی پہچانے جاتے ہیں۔ لیکن پاکستانی معاشرت میں نام و نسب اور جذبات احساسات اہمیت کے حامل ہیں۔ یہاں لوگ ایک دوسرے کے دکھ درد اور غم میں شریک ہوتے ہیں۔

یہ ہیں نئے لوگوں کے گھر سچ ہے اب ان کو کیا خبر

دل بھی کسی کا نام تھا غم بھی کسی کی ذات تھی (۴۴)

مغربی طرز معاشرت میں خانگی نظام ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گیا ہے۔ اس خانگی نظام کے فوائد کا احساس شدت سے پاکستانی تارکین وطن کو دیارِ غیر میں ہوتا ہے۔ مشرقی خانگی نظام فرد کے گوناگوں مسائل کے باوجود معاشی، جذباتی، روحانی، نفسیاتی اور معاشرتی حوالے سے پناہ گاہ کے طور پر سہارا فراہم کرتا ہے۔ یہاں کا بودوباش بھی سب کا ایک جیسا ہے۔ جس کو مغربی ماحول میں شدت کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے۔

تھی کبھی ایک بودوباش اپنی

تھے کبھی ایک خاندان سے ہم (۴۵)

مغربی معاشرے میں وقت کی قلت ایک اہم مسئلہ ہے۔ وقت کی تیزی کی وجہ سے نوجوانوں کے پاس بزرگوں کے پاس بیٹھنے کا وقت نہیں ہوتا۔ جس کی وجہ سے وہ بزرگوں کے تجربات سے استفادہ نہیں کر پاتے۔ یورپین ممالک کے بزرگوں کو بڑھاپے میں "اولڈ پیپلز ہومز" میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ جہاں میں تنہائی کا احساس ان کا گلہ گھونٹ دیتی ہے۔ پاکستانی تارکینِ وطن اس ماحول میں اپنے ماضی کے ان بزرگوں کو یاد کرتے ہیں۔ جن کے پاس ایک ہجوم قصے کہانیاں سننے کے لیے بیٹھا ہوتا تھا۔ ان قصے کہانیوں کا کوئی نہ کوئی اخلاقی سبق ہوتا تھا۔ اب تو وہ نسل معدوم ہوتی جا رہی ہے۔

جب تک بوڑھے زندہ تھے اس بستی میں

راتوں کے سینے میں کتنے قصے تھے (۴۶)

۷۔ سیاسی و معاشرتی ورثے سے دوری:

سیاست کو معاشرت سے اور معاشرت کو ادب سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ادب کا براہ راست تعلق طرزِ زندگی سے ہوتا ہے۔ یہ ہر دور میں زندگی میں پیدا ہونے والی مختلف ارتعاش کا اثر قبول کرتی ہے۔ پہلی جنگ عظیم

کے ساتھ ہی باقاعدہ اردو ادب میں سیاسی موضوعات نے جگہ بنائی۔اس جنگ کے بعد سیاسی، معاشرتی اور مذہبی حوالے سے نظریات میں تبدیلیاں دیکھنے کو آئی۔ جس کا برجستہ اظہار ادب کے اندر دکھائی دیتا ہے۔

۱۶۰۸ء میں جہانگیر کے زمانے میں برطانیہ نے برصغیر میں برطانوی سفیر سر طامس رو کے توسط سے اپنے قدم جمانا شروع کیے تھے۔ جس کے بعد برطانیہ سترھویں اور اٹھارویں صدی میں ایسٹ انڈین کمپنی کے ذریعے ہندوستان کی سیاست پر قابض ہوا۔ دورانِ قیام برطانیہ ہندوستان کی سیاست اور معاشرت پر براہ راست اثرانداز ہوا۔ دوسری جانب انجمن پنجاب کے ذریعے شعر وادب تبدیلیوں کے عمل سے گزارا۔ اٹھارویں اورانیسویں صدی میں تارکینِ وطن مختلف مقاصد کے حصول کے لیے برطانیہ اور مختلف یورپین ممالک کا اذنِ سفر باندھنے لگے۔ بیسویں صدی کے اول میں ہندوستان کے حالات کچھ ایسے پیدا ہوئے کہ برطانیہ سے آزادی اور برصغیر کی تقسیم کے نعرے لگنا شروع ہوئے۔ ایسے میں کچھ سیاسی محرکات اور سازشوں نے طول پکڑا جس نے اس جذبے کو مزید تقویت بخشی۔ ہندوستان کی دونوں بڑی قومیں ہندو اور مسلم ،جو اب ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑی تھی۔ ایک ہزار سال اکھٹے رہ چکی تھی۔ جن کی تہذیب وثقافت، طرز معاشرت، سیاسی امواراور اخلاقی اقدار کا نظام مضبوط ہونے کے ساتھ ساتھ یکجا تھا۔ لیکن اب حالات ایسے پیدا کر دیے گئے تھے کہ لوگ ان نعروں سے امیدیں وابسطہ کر چکے تھے۔ وہ حال سے بیزار ہو چکے تھے۔ بالا آخر تقسیم ہند نے برطانیہ کے راج کو ختم کر دیا۔

تقسیم ہند کے بعد مسلمانوں نے ایک امید کے تحت ہندوستان کے مختلف علاقوں سے ہجرت کر کے پاکستان کا رخ کیا۔ جہاں جلد ہی انہیں امیدوں پہ پانی پھرتا ہوا دکھائی دیا۔ لیکن اس ہجرت میں تہذیبی وثقافت سے زیادہ جغرافیائی حوالے سے تبدیلی کو شدت سے محسوس کیا گیا۔ اسی دوران سیاسی حوالے سے مختلف مارشل لاء نے سیاسی حوالے سے مایوسیوں میں اضافہ کیا۔ ابھی ایک سانحہ سے گزرے نہیں تھے کہ سقوط ڈھاکہ نے بچی کچی کسر بھی نکال کرر کھ دی۔ اس سانحہ نے قوم میں افراتفری اور ناامیدی کو پیدا کیا۔ شعراءواور ادیب چونکہ معاشرے کے حساس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے یہ کیسے ناممکن ہو تا کہ وہ اس کا اثر قبول نہ کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے نہ صرف اثر قبول کیا بلکہ اس عہد کی ترجمانی اپنی تخلیق میں کیں۔ جس پر بہت سے لوگوں کو ملک بدر بھی کیا گیا۔

نوے کی دہائی میں ایک بڑی تعداد نے یورپین اور خلیجی ریاستوں میں ہجرت کو ترجیحی دی۔ ان میں زیادہ تر وہ شعراء شامل تھے جو ہجرت کر کے پاکستان میں مہاجر کہلائے تھے۔ یہ ہجرت نان نفقہ کے لیے کی گئی تھی۔ ان تارکین وطن شعراء نے مغربی ممالک میں جا کر نئے ماحول میں مختلف مسائل کو گلے لگایا۔ جہاں کی تہذیب وتمدن،

طرزِ معاشرت اور نظامِ اقدار ہندوستان سے یکسر مختلف تھا۔ اس ہجرت نے شناخت، مہاجرت، ہجرت کا کرب، غریب الوطنی، خانگی نظام، بے سمتی اور ازلی و ابدی نارسائی جیسے موضوعات کو اردو شاعری میں جگہ دی۔ ایسے مایوس ماحول میں وطن کی شدید یاد نے ناسٹلجیا کی صورت میں سر اٹھایا۔ جس میں شعراء نے ماضی کی یادوں میں مشرقی سیاسی اور معاشرتی ماحول کو تلاشنے کی سعی کی ہے۔

مذکورہ بالا پیراگراف میں ان محرکات پر روشنی ڈالی گئی ہے جن کی بدولت پاکستان سے ہجرت کی گئی تھی۔ ہجرت در ہجرت کا سفر خوابوں کا سفر تھا۔ لیکن ان خوابوں کی کوئی تعبیر نہ ہو سکی۔ ان تارکینِ وطن کے مقدر کی ایک ایسی خزاں ٹھہری جس میں دور دور بہار کی نوید نہ تھی۔ جو اب تک تارکینِ وطن کو نہیں ملی۔ اس حال نے تارکینِ وطن کو مایوسیوں کے گہرے اندھیروں میں دھکیل دیا ہے۔ جہاں نہ تو پیچھے کا کوئی رستہ دکھائی دیتا ہے اور نہ آگے کسی منزل کا پتا ملتا ہے۔ ایک مسلسل بے سمتی ہے جس پر زندگی کی گاڑی رواں دواں ہے لیکن معلوم نہیں اس سفر کا انجام کیا ہے۔

دلوں میں خواب ہیں اور جھولیوں میں پت جھڑ ہے

عجیب حال میں ہیں بیکسانِ موسمِ گل (۴۷)

اگر آزادی کے خواب کو دیکھا جائے تو ہزاروں قربانیاں کے بعد ایک ملک کی صورت میں خوابوں کو تعبیر ملی۔ لیکن جلد ہی سیاسی و معاشرتی حالات نے فرد کو موجود سے بیزار کر دیا۔ چند عناصر نے ملک کو اپنے ہاتھ میں لے کر اپنے ناپاک مقاصد کو حاصل کرنے کے ملک و قوم کے مستقبل کو داؤ پر لگا دیا۔ ان عناصر نے ملک و قوم کو دولخت کر دیا۔ سقوط ڈھاکہ کے سانحے نے ایک بار پھر قوم کو مایوسیوں میں مبتلا کیا۔

شبنم کو ریت پھول کو کانٹا بنا دیا

ہم نے تو اپنے باغ کو صحرا بنا دیا (۴۸)

ساقی فاروقی کی شاعری میں سیاسی و معاشرتی مسائل انسانی نفسیات پر گہرے اثرات مرتب کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ نفسیاتی سطح پر ڈر اور خوف کے زیرِ اثر ایک عجیب کشمکش کے عالم میں ہیں۔ یہ ڈر اور خوف مسلسل تاریکی کی پیداوار ہے۔ وہ اس ناتمام رات کے اسیر بن چکے ہیں۔ اس کیفیت میں دن ان کے لیے رات سے زیادہ جبر کی علامت کے طور پر سامنے آتا ہے۔ وہ رات کو دن سے بہتر قرار دیتے ہیں اور رات کی قید و بند میں رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ ایک نفسیاتی کیفیت ہے۔ جو ان کی شاعری میں دوہری ہجرت کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے۔ ان ہجرتوں

نے ان کے خوابوں کو مسمار کر دیا ہے۔وہ اب کسی نئی صبح کا انتظار نہیں کر رہے۔وہ ان صبحوں سے خوف ذدہ ہیں جہنوں نے ان کا سب کچھ ان سے چھین لیا ہے۔لیکن اس مایوس ماحول میں بھی خواب دیکھنے سے باز نہیں آتے۔

میں وہ رات کا قیدی اپنے خواب جدا نہ کروں

صبح سے اتنا خوف ذدہ ہوں نیند بہانہ کروں(۴۹)

اس دوران ملک میں ایک جمہوری حکومت کا تختہ پلٹ کر جنرل ضیاء الحق نے طاقت کے زور میں جمہوریت پر شبِ خون مارا اور ملک میں صدارت کا منصب سنبھالا۔انہوں نے آئین کو معطل نہیں کیا اور نوئے دن میں قوم کو الیکشن کروانے کی یقین دہانی کروائی۔لیکن اسی دورانیہ میں پیپلز پارٹی کے بانی ذوالفقار علی بھٹو کو ایک شہری کے قتل کا مقدمہ چلا کر پھانسی کے تختے پر چڑھا دیا۔ان صورت حال کا ذکر منصور آفاق کی شاعری میں ایک کرب کی صورت میں دکھائی دیتا ہے۔

کچھ بتاتی ہیں بندوقیں سڑکوں پہ چلتی ہوئی شہر میں

کس طرح، کب ہوا، کون مسند نشیں، میں نہیں جانتا(۵۰)

اس نے پہلے مارشل لاء میرے آنگن میں رکھا

میری پیدائش کا لمحہ پھر اسی سن میں رکھا(۵۱)

۸۔انسانی رشتوں کا انہدام:

بیسویں صدی دنیا کی تاریخ کی طرح برصغیر کی تاریخ میں اہمیت کی حامل ہے۔ اس دور میں تقسیمِ ہند ہوئی۔ جس میں لاکھوں لوگوں نے نقل مکانی کی۔ دوران ہجرت قتل وغارت، لوٹ مار اور عصمتوں کی پامالی ہوئی۔ان سماجی وتہذیبی تبدیلیوں نے فرد کے تصورات کو بدل کر رکھ دیا۔ جس کے نتیجے میں باہمی تعلقات میں اخوت اور بھائی چارہ مٹ کر رہ گیا۔اخلاقی اقدار کی دھجیاں اڑائی گئی۔مادیت پرستی نے انسان کو انسان کی عظمت سے گرا دیا۔ جس میں ذاتی مفاد کے حصول کے لیے لوگ ایک دوسرے کو پہچاننے سے انکاری ہوئے۔ایسے ماحول سے شعراء متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔انہوں نے اس خونی اور دردناک مناظر کو نہ صرف اپنی آنکھوں سے دیکھا بلکہ اسے اپنی تخلیق میں موزوں بھی بنایا۔اس تقسیم کے نتیجے میں معاشرتی، معاشی اور تہذیبی مسائل نے جنم لیا۔ان مسائل میں ایک اہم مسئلہ انسانی رشتوں کا انہدام تھا۔

ہجرت کے بعد نئی طرزِ معاشرت میں اجنبیت اور تنہائی کے احساس نے فرد کو ناسٹلجی بنا دیا۔ یہ احساس اس وقت شدت اختیار کرتا ہے جب لوگوں کو اپنا مستقبل صاف دکھائی نہیں دیتا۔ یوں وہ بہتر مستقبل کے لیے دوہری ہجرت کے کرب سے گزرتے ہیں۔ ساٹھ کی دہائی کے بعد سے تاحال لوگ مغربی اور خلیجی ریاستوں میں قسمت آزمائی کے لیے اذنِ سفر باندھتے آرہے ہیں۔ دوہری ہجرت کرنے والے ان تارکینِ وطن کو بالخصوص مغربی مادیت پرست معاشرت میں بھی اجنبیت کے سائے اپنے گھیرے میں رکھتے ہیں۔ وہاں کی صنعتی ترقی نے انسانی زندگی کو مشین کا پرزہ بنا دیا ہے۔ انسانوں کی جگہ مشینوں نے لے لی ہے۔ انسانوں کی وقعت گھٹتے گھٹتے کم ہو گئی ہے۔ معاشرتی تعامل کے لیے وقت نکالنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ اگر کچھ وقت نکل بھی آئے تو ذہنی و جسمانی تھکن کو دور کرنے والے دوست احباب میسر نہیں آتے۔ جن کی کمی کا احساس ان میں ناسٹلجیائی جذبات کو تقویت بخشتا ہے۔

مذکورہ بالا مسائل کی وجہ سے وقت کی قلت کا احساس اور وقت کے لامتناہی جبر واستبداد کی وجہ سے انسانی رشتوں کا انہدام احمد مشتاق کی شاعری میں مختلف استعاروں کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ اس بے رحم وقت نے نہ صرف ان سے گوہرِ نیاب چھینے بلکہ ایک پوری تہذیب کو مٹا کر رکھ دیا۔ گردشِ حالات نے انہیں آب و دانہ کی جستجو میں اپنے محبوب گلشن سے دور جا پھینکا تھا۔ لیکن جب سازگار حالات پیدا ہوئے اور پلٹ کر دیکھا تو وقت ایک سفاک قاتل کی صورت میں دکھائی دینے لگا۔ جس نے گلشن کا اصل رنگ وروپ چھین لیا ہے جس کو شاعر نامساعد حالات میں چھوڑ کر گیا تھا۔ وہ رنگ وروپ ان کے دوست احباب تھے جس کی وجہ سے باغ کی رونقیں بحال تھیں۔

وہی گلشن ہے لیکن وقت کی پرواز تو دیکھو
کوئی طائر نہیں پچھلے برس کے آشیانوں میں (۵۲)

سرور الہدی رقمطراز ہیں: "احمد مشتاق کی خوبی یہ ہے کہ وہ اسے زندگی کا ایک المیہ صورت عطا کر دیتے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے "آگ کا دریا" کی طرح ان کے یہاں بھی وقت کے آگے کوئی شخصیت ٹک نہیں پاتی۔"(۵۳)

گویا مشتاق وقت کو لافانی اور بے مہار قوت کا سرچشمہ گردانتے ہیں۔ جو ہر ذی روح شے کے ساتھ ظالمانہ رویہ برتتی ہے۔ مشتاق ان یاروں، دوستوں اور رشتوں کو پلٹنے کے بعد تلاش کرتے ہیں جو ہر دل عزیز تھے۔ جن کو لاکھ مجبوریوں کے تحت وطن عزیز میں چھوڑ کر دیارِ غیر کا رخ کرنا پڑا تھا۔ ان کی شاعری میں دھوپ علامتی انداز میں وقت کے جبر کا استعارہ ہے۔ لیکن یہ ایک گہری معنویت رکھتی ہے جس میں دوست احباب کے ساتھ گزرے ایام، محبوب سے ملاقاتیں اور حسین لمحات شامل ہیں۔ لیکن یہ سب وقت کے جبر واستبداد کا شکار ہوئے۔

جاتے ہوئے ہر چیز یہیں چھوڑ گیا تھا

لوٹ ہوں تو اک دھوپ کا ٹکڑا نہیں ملتا(۵۴)

اس وقت کی سفاکی نے نہ صرف اس کے دوست احباب کو اس سے چھین لیا ہے بلکہ اس کے ماضی کے چہرے کو بری طرح مسخ کر دیا ہے۔ اگر وہ چیز کہیں کوشش سے مل بھی جائے تو شناخت کرنا ناممکن ہوتا ہے کہ آیا یہ وہی شے ہے جس کے ساتھ زندگی کی بہاریں تھی۔ کہیں کہیں یہ وقت دنیا کی بے ثباتی کا فلسفہ بھی سلجھاتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ کہ دنیا محض عارضی شے ہے ہر چیز کی اصل فانی ہے۔ جو شاعر کو مزید غمگین کر دیتی ہے۔

دل فسردہ تو ہوا دیکھ کہ اس کو لیکن

عمر بھر کون جواں کون حسین رہتا ہے(۵۵)

ساقی فاروقی بھی مغربی معاشرے پر عمیق نگاہ رکھے ہوئے ہیں۔ مغربی شخص حرص و ہوس کا پوجاری بن چکا ہے۔ زندگی کی تمام آسائشیں حاصل کرنے کے لیے وہ اخلاقیات کی حدیں پھلانگ چکا ہے۔ جس میں انسان کی قدو منزلت دکھاوے کے سوا کچھ نہیں۔ انسان اب انسان سے حد درجہ دور ہو چکا ہے۔ مشرقی تہذیب میں اب بھی کسی حد تک انسان کی قدر موجود ہے۔ وہاں کا انسان کتنا ہی شیطان صفت بن چکا ہو، اس کے دل میں تھوڑا بہت نیکی کا جذبہ باقی ہے۔ لیکن مغربی تہذیب میں اسے فقدان کا سامنا ہے۔ یہاں آنے والا ہر شخص مال و متاع جمع کرنے اور اس مال سے معاشرے میں عزت و مقام حاصل کرنا چاہتا ہے۔ جبکہ عزت و مقام مال و دولت سے نہیں بلکہ دل میں جگہ بنانے سے ملتا ہے۔ لیکن موجودہ عہد میں دل بھی بے داغ نہیں ملتے۔

صرف حشمت کی طلب جاہ کی خواہش پائی

دل کو بے داغ سمجھتا تھا، *جزامی نکلا*(۵۶)

بے داغ دلوں نے محبت کو ناپید کر دیا ہے۔ اب محبت بھی دھن دولت کو دیکھ کر کی جاتی ہے۔ موجودہ زمانے میں محبت کا خود بخود ہو جانا ،افسانوی داستان معلوم ہوتا ہے۔ ہر شخص آسائشِ دنیا کے تعاقب میں جائز اور ناجائز کسی عمل سے گریز اں نہیں کرتا۔ وہ کچھ بھی کر گزرنے سے باز نہیں آتا۔ یہاں تک کہ آسائشِ دنیا کے لیے محبت جیسے پاکیزہ جذبے سے مکر جاتا ہے۔

یوں ہے کہ تعاقب میں ہے آسائشِ دنیا

یوں ہے کہ محبت سے مکر جائیں گے اک دن(۵۷)

منصور آفاق کی شاعری میں برطانوی معاشرے میں وقت کی تیز رفتاری سے انسانی تہذیب کے مٹنے کا المیہ موجود ہے۔ وقت کے اس جبر نے معاشرتی تعامل کا قتل کر دیا ہے۔ وہ وقت کی قلت سے بخوبی آگاہ ہیں۔ مشرقی ممالک میں اب بھی کسی حد تک وہ تہذیب موجود ہے۔ جس میں لوگ مل جل کر بیٹھا کرتے تھے۔ اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ کو سانجھا سمجھتے تھے۔ بالخصوص چوپال پر بزرگوں کے پاس بیٹھنا اور ان کے قصہ کہانیوں اور زندگی کے بارے میں تجربات کو سننا ایک معمول مشغلہ ہوتا تھا۔ لیکن مغربی ممالک میں منصور آفاق اس تہذیب کو مٹتا ہوا اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ جہاں انسان کے پاس فرصت کے لمحات میں اپنے لیے وقت نہیں ہوتا وہاں بزرگوں کے پاس بیٹھنا یا ان کے قصہ کہانیوں کو سننا تو وقت کا ضیاع شمار کیا جاتا ہے۔ منصور آفاق برطانوی شخص کی اس تنہائی کے کرب کو نہ صرف محسوس کرتے ہیں بلکہ اظہار میں بھی لاتے ہیں۔ جہاں کا انسان مصرفیت کے لمحات سے آنکھیں چرا کر ایک ایسے انسان کا متلاشی ہے جو اس سے بات چیت کر سکے۔

وقت کی رو میں فراغت کا نہیں ہے کوئی لمحہ
اور اک بڑھیا کسی سے بات کرنا چاہتی ہے (۵۸)

مذکورہ بالا انسان کا ملنا تو دور کی بات ہے وہاں کی زندگی میں اپنے لیے وقت نکالنا بھی مشکل ہے۔ وہاں کے انسان کا معمول ہے کہ وہ دن رات کام کاج میں مصروف رہتا ہے۔ اس کی زندگی گھر سے دفتر اور دفتر سے گھر تک سمٹ کر رہ گئی ہے۔ تارکینِ وطن اس زندگی سے شروع شروع میں مادی خواہشات کو حاصل کرنے کے لیے محبت کرتے ہیں۔ وہ محنت کرتے ہیں اور خوب پیسا بناتے ہیں لیکن اس معمول سے جلد اکتا جاتے ہیں اور مشرقی تہذیب کو یاد کرتے ہیں۔ جہاں صبر و شکر سے کام لیا جاتا ہے۔ جہاں اپنا تو اپنا دوسروں کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔

منصور آفاق برطانیہ کی زندگی کے معمول سے اکتا چکے ہیں جہاں کا انسان سارا سارا دن کام کاج میں مصروف رہتا ہے۔ وہ جدید پیرائے میں خود کو تلاشتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ سفر پیدل چل کر طے نہیں ہو سکتا بلکہ یہ ایک گاڑی کا متقاضی ہے۔ جہاں کا سفر دو سو کلومیٹر سے کم معلوم نہیں ہوتا۔ دو سو کلومیٹر سے مراد خود سے ملنے کے لیے بھی ایک طویل فاصلہ طے کرنا پڑے گا۔ جس کو طے کرنا بھی ایک نئی تھکن کاندھوں پر لادنے کے مترادف ہے۔

پھر اس کے بعد لمبا راستہ ہے
ابھی تو شام تک دفتر پہ میں ہوں
اٹھو بیڈ سے چلو گاڑی نکالو
فقط دو سو کلومیٹر پہ میں ہوں (۵۹)

اکیسویں صدی نے انسانی تہذیب وثقافت کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ وقت کے جبر اور ترقی کی رفتار نے زمانے کی شکل وصورت کو بدل دیا ہے۔ جس کی زد میں ہر دوسرا ملک آیا ہے۔ گھر کا روایتی تصور مٹ چکا ہے۔ جہاں ایک پورا کنبہ مل جل کر رہتا تھا۔ جو ایک دوسرے کے دکھ درد کو سانجھا سمجھتا تھا۔ برطانیہ جیسا ترقی یافتہ ملک بھی اس کی لپیٹ میں ہے۔ جہاں گھر کا روایتی تصور ختم ہو چکا ہے۔ وہاں کی زندگی گھر سے فلیٹوں تک سمٹ کر رہ گئی ہے۔ جہاں دکھ درد سے انسان کو تن وتنہا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ برطانوی باشندے تو اس ماحول کے عادی ہو چکے ہیں لیکن پاکستانی تارکینِ وطن اس ماحول سے اب تک کٹے ہوئے ہیں۔ وہ اب تک مشرقی گھر کے تصور کو ذہن نشین کیے ہوئے ہیں جو انہیں رہ رہ کر یاد آتا ہے۔

گھر کے اندر دیواروں کا راج نہ تھا

ایک ہی آنگن میں سب سویا کرتے تھے [۶۰]

۹۔ بے یقینی اور لاتعلقی کا احساس:

دوہری ہجرت نے برصغیر کے لوگوں کو جسمانی اور ذہنی ونفسیاتی سطح پر گوناگوں مسائل میں الجھا کر رکھ دیا ہے۔ تقسیم ہند کے بعد لوگ آنکھوں میں آزادی کے حسین خواب لے کر نئے ملک میں آبائی سرزمینوں کو چھوڑ کر آئے تھے۔ اس ملک سے انہیں ہزاروں امیدیں وابستہ تھیں۔ نئے ماحول میں انہیں تنہائی کا شدید احساس، ذہنی انتشار اور بے یقینی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس ماحول میں انہیں اعتماد، پائیدار تعلق، پرخلوص محبت وبھائی چارہ اور ہمدردی کے جذبات مفقود دکھائی دیے۔ جس نے بے یقینی اور لاتعلقی کے احساس کو نہ صرف پیدا کیا بلکہ مستقبل کے بارے میں سوچنے پر مجبور کیا۔ لیکن جب یہ مستقبل تاریک دکھائی دیا تو حال سے آنکھیں چرانے کے سوا کوئی اور چارہ نہ تھا یوں شعراء ماضی میں پناہ گزیں ہوئے تاکہ یہ ڈر خوف کی فضا کسی حد تک کم ہو سکے۔

تقسیم کے بعد آبادی کا ایک بڑا حصہ مغربی پاکستان اور ایک مٹھی بھر لوگ مشرقی پاکستان میں منتقل ہوئے۔ مشرقی پاکستان میں صوبوں کی خودمختاری کے لیے کیے گئے مطالبے نے مختلف اقتصادی، سیاسی، سماجی اور معاشرتی مسائل کو جنم دیا۔ جو بعد میں باقاعدہ زبان کے مسئلے کی صورت میں سامنے آیا۔ جس کی بنیاد قائداعظم محمد علی جناح کی ڈھاکہ میں زبان کے حوالے سے کی گئی تقریر بنی۔

”آزادی کے فوراً بعد مرکزی حکومت کی بعض عاقبت نااندیشانہ پالیسیوں کی وجہ سے بنگالیوں نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا کہ انہیں نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ قیام پاکستان کے صرف سات ماہ بعد یعنی مارچ ۱۹۴۸ میں دستور ساز اسمبلی کے ایک مسلم لیگی رکن نے کہا

کہ محسوس ہوتا ہے کہ موجودہ نظام میں مشرقی بنگال کو واقعتا نظر انداز کیا جارہا ہے ،دستور ساز اسمبلی میں دیا گیا یہ بیان بنگال کے احساس محرومی کی عمومی صورت کا ترجمان تھا اور اس احساس محرومی میں وقت کی ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا چلا گیا۔"(۶۱)

بنگال کی زبان کو۱۹۵۶ء میں سرکاری زبان میں تو شامل کر لیا گیا لیکن ۱۹۵۸ء کو جنرل ایوب خان نے مارشل لا نافذ کیا۔۱۹۶۵ء کی جنگ نے مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان میں مزید پیچیدگیوں اور دوریوں کو بڑھایا۔ جس سے علاقائی خود مختاری ،لسانی تنازعات اور معاشی تفاوت میں اضافہ ہوا۔ جس نے احساسِ محرومی کو مزید تقویت بخشی۔۱۹۶۶ء میں عوامی لیگ کے چھ نکات سامنے آئے ،جو ۱۹۷۱ء میں تقسیم کا سبب بنے۔ مسلمانوں کو ایک بار پھر سے اسی ہجرت کے کرب سے گزرنا پڑا جس سے وہ تقسیم ہند کے وقت گزرے تھے۔ جس سے لوگوں میں بے یقینی اور لاتعلقی کا احساس زور پکڑ تا چلا گیا۔ لیکن یہ احساس اس وقت مزید بڑھا، جب عالمی سطح پر نائن الیون کا واقعہ پیش آیا۔ ۲۰۰۱ء میں امریکہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پنٹاگون پر القاعدہ نے چار جہازوں کے ساتھ حملہ کیا۔ جس میں بھاری جانی ومالی نقصان اٹھانا پڑا۔ یوں امریکہ نے القاعدہ کا تعاقب کرنے کے لیے نیٹو فوج کو افغانستان میں اتار کر جنگ کا آغاز کیا۔ پاکستان نے ایسے حالات میں افغانستان کے خلاف فضائی حدود کھول دی۔ جس کے نتائج بعد میں سامنے آئے۔ طالبان کو ایک زمانے میں سی آئی اے نے فوجی تربیت دے کر روس کے خلاف استعمال کیا تھا۔ اب وہی طالبان امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے لیے بھاری نقصان کا سبب بنے لگے تھے۔ امریکہ کے ساتھ ساتھ پاکستان بھی اس تباہ کاری اور دہشت گردی کا نشانہ بنا۔ جس میں ہزاروں قیمتی جانوں سے ہاتھ دھونا پڑا۔ ملکی دہشت گردی کو کم کرنے کے لیے مختلف فوجی آپریشن کیے گئے اور کیے جارہے ہیں۔

مذکورہ حالات کے پیش نظر تارکین وطن کی ایک بڑی تعداد نے ہجرت کر کے پرامن ممالک کا اذنِ سفر باندھا۔ جہاں انہیں بنیادی ضروریات تو میسر آئی لیکن بے یقینی کی فضا بھی پیدا ہوئی۔ ایک طرف معاشی آسودگی کی وجہ سے بے یقینی تو دوسری طرف نئے ماحول میں ذہنی اذیت اور کشمکش کا سامنا کرنا پڑا۔ جان ومال کا تحفظ تو حاصل ہوا لیکن انہیں کئی ایک ڈر اور وسوسوں نے گھیر لیا۔ نئی سوسائٹی میں شناخت ،بے چہرگی ،اور دیگر محرومیوں کے مسائل نے سر اٹھایا۔ مشرق اور مغرب کی ثقافت اور تہذیب میں واضع فرق موجود ہے۔ وہاں کے تارکین اس فرق سے بخوبی آگاہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں اپنی تہذیب وثقافت ،مذہب ،زبان اور سماجی اقدار کے کھو جانے کا ڈر رہتا ہے۔ یہ ڈر اور خوف تارکین وطن کو حال سے بیگانگی اور ماضی میں پناہ لینے پر مجبور کرتا ہے۔

ڈاکٹر شیر علی رقمطراز ہیں:

"مغربی دنیا میں مقیم برصغیر پاک وہند کے باشندے کو اگرچہ وہاں پر ہر طرح کی معاشی اور معاشرتی آسودگی حاصل ہو جاتی ہے لیکن اپنی تہذیب، اپنی زمین اور اپنی جڑوں سے کٹ جانے کا احساس اس کو بہ ہر صورت بے کل رکھتا ہے۔"(۶۲)

احمد مشتاق دیارِ غیر میں بے یقینی اور لاتعلقی کو نہ صرف محسوس کرتے ہیں بلکہ اس کو اظہار میں بھی لاتے ہیں۔ مذکورہ بالا پیراگراف میں جس طرح گفتگو کی گئی ہے کہ دیارِ غیر میں شناخت، بے چہرگی، تہذیب و ثقافت، مذہب، زبان اور اقدار کے چھین جانے جیسے مسائل تارکین وطن میں لاتعلقی اور بے یقینی کی فضا کو پیدا کرتے ہیں۔ ایسے حالات میں تارکینِ وطن میں ایک ایسی بے یقینی جنم لیتی ہے جو ایک ڈورانی رات کا روپ دھار لیتی ہے اور خوف وہراس پھیلاتی ہے۔ ایسا خوف جس کی زد میں ہر دوسرا پاکستانی تارکینِ وطن ہے۔ اس خوف زدہ انسان کے ساتھ اس کا حسین ماضی ہے۔ جو اس پر خوف کے سائے گہرے نہیں ہونے دیتا۔ یہ ماضی اسے کہتا کہ خوف اور ڈر اپنے دل سے نکال پھینکو کیوں کہ میں خوشگوار یادوں کے ہمراہ تمہارے ساتھ ہوں۔

رات ڈراؤنی سہی رو نہیں غم زدہ نہ ہو
میں ترے ساتھ ساتھ ہوں دیکھ مجھے پکار کے(۶۳)

لیکن ڈر اور خوف ہے کہ کم ہونے کا نام نہیں لے رہا۔ تارکینِ وطن کو ہر لمحے آسمانی بجلی کی طرح یہ ڈر اور خوف نفسیاتی سطح پر پریشان کیے رکھتا ہے۔ اس کا دل عجیب وسوسوں میں گھیرا ہوا ہے۔ وہ اسی ڈر اور خوف میں مبتلا ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی نسلیں بہتر مستقبل کے لیے بہترین معاشرے میں مستقل پڑاؤ کے چکر میں اپنی شناخت ہی نہ کھو بیٹھیں۔

ہر آن برق چمکتی ہے دل دھڑکتا ہے
مری قمیص پہ تنکے ہیں آشیانوں کے(۶۴)

ایسے حالات میں احمد مشتاق اپنے ملک کو یاد کرتے ہیں لیکن وہاں کے حالات بھی کچھ سازگار نہیں رہے۔ وہ ملکی حالات پر بھی کراہتے ہیں۔ پاکستان میں آئے دن بڑھتی دہشت گردی نفسیاتی سطح پر ڈر اور خوف کو پیدا کر رہی ہے۔ اس ڈر اور خوف نے مذہبی عبادت گاہوں تک کو ویران کر دیا ہے۔ عوام الناس اور شرفا کے سر پر موت کے سائے منڈلا رہے ہیں۔ حکومت وقت کی یقین دہانی کے باوجود دہشت گردی کے واقعات پر قابو نہیں پایا جا رہا۔

دیکھیے اہل دین کا اعجاز
موت بھی ہو گئی شریک نماز(۶۵)

غیر تو خیر غیر ہیں جو ملک کو تہس نہس کرنے پر تلے ہوئے ہیں لیکن صد افسوس تو اس وقت ہوتا ہے جب ملکی سازشوں میں اپنے لوگ بھی ملوث پائے جاتے ہوں۔ مشتاق ایسے لوگوں کی بخوبی نشاندہی کرتے ہیں جو عوام میں خوف وہراس کی فضا کو بڑھانے میں کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ ملکی انتظامی ادارے ہیں۔ جو لوٹ مار میں ملوث ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں کا اعتماد اداروں سے اٹھتا جارہا ہے۔

دریچے کھل رہے ہیں شور برپا ہے مکانوں میں
سپاہی چوریاں کرواکے لوٹ آئے ہیں تھانوں میں[۶۶]

اسی اجڑتے ملک اور شہروں میں احمد مشتاق کا بچپن اور جوانی گزری ہے۔ ان شہروں میں لاہور شہر کی رونقیں اور بالخصوص ٹی ہاؤس کی یادیں ان کی چشم کو اب بھی آبدیدہ کردیتی ہیں۔ یہ یادیں رفتہ رفتہ مانند پڑتی جارہی ہیں۔ مشتاق بچی کچی شہروں کی رونقوں کو سنبھالنے کے لیے اہلِ وطن کو سوچنے کی تلقین کرتے ہیں۔

جیسے ممکن ہو بچالو یہ اجڑتے ہوئے شہر
پھر نہ یہ رنگ نہ چہرے نہ مکاں دیکھوگے[۶۷]

ساقی فاروقی کی شاعری میں بھی اسی قسم کے ڈر اور خوف کی نوعیت کو شدت کے ساتھ محسوس کیا جاسکتا ہے۔ انہیں نئی نسلوں کا مستقبل تاریک دکھائی دیتا ہے۔ یہ راتیں انہیں پریشان کیے ہوئے ہیں۔ اسی پریشانی کے عالم میں انہیں کئی چین میسر نہیں آرہا۔ وہ محسوس کررہے ہیں کہ بے یقینی اور لاتعلقی سے پیدا ہونے والا خوف ان کی روح میں سرایت کرچکا ہے۔ اس خوف کے نتیجے میں شدید تنہائی کے جذبات ابھرتے ہیں۔

جانے کیا ہونے والا ہے نیند نہ آئے خوف سے
رات ڈرائے شہر ڈرائے ایک اکیلی ذات کو[۶۸]

خوف سے پیدا ہونے والی اس تنہائی میں ان کی شاعری میں ناسٹلجیائی جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ جس میں وہ اپنے وطن کو یاد کرتے ہیں۔ جہاں کی تہذیب و ثقافت ان کی شناخت تھی۔ لیکن مجبوریِ حالات نے ان کو ہجرت کرنے پر مجبور کیا۔ ایسی ہجرت جو اندھیر نگری تھی۔ یہ ایسا گرداب ہے جہاں پر انہیں آسائشِ دنیا لے گئی اور اب وہاں سے واپسی کا راستہ ممکن نہیں۔

مٹی تھی خفا، موج اٹھالے گئی مجھ کو
گرداب میں ساحل کی بلا لے گئی مجھ کو[۶۹]

پاکستانی تارکینِ وطن کو پاکستان کی سرزمین شدت سے یاد آتی ہے۔ آبائی وطن کے حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں لیکن اس کا سایہ برگد کے پیڑ جیسا ہوتا ہے۔ جس کی چھاؤں میں اپنائیت ہوتی ہے۔ حالات وواقعات کے پیشِ نظر انسان کو ہجرت کے کرب سے گزرنا پڑتا ہے۔ منصور آفاق ملک میں درپیش مصائب کو گلے لگانے پر رضامند دکھائی دیتے ہیں لیکن برطانیہ کی سرزمین میں درپیش مصائب پر یتیمی کا رونا روتے ہیں۔ خوف اور ڈر نے نفسیاتی سطح پر انہیں اس قدر متاثر کیا ہے کہ وطن سے دوری اور دوری کے سبب کو جاننے سے بھی قاصر دکھائی دیتے ہیں۔

کھینچ لی میرے پاؤں سے کس نے زمیں میں نہیں جانتا
میرے سر پہ کوئی آسماں کیوں نہیں میں نہیں جانتا(۷۰)

ہر وقت انہیں مشتاق کی طرح عجیب واہموں اور وسوسوں کے آسیب اپنے گھیرے میں رکھے ہوئے ہیں۔ یہ آسیب خوف کی پیداوار ہیں۔ انہیں لگتا ہے کہ خوف جیسی کوئی شے ان کے وہم وگماں کا حصہ ہے۔ جو ہر وقت ہراس پھیلائے ہوئے ہے۔

واہمہ ہے سانحہ کا، خدشہ ان ہونی کا ہے
خوف جیسی ہے مرے وہم وگماں میں کوئی چیز(۷۱)

علی ارمان کی شاعری میں بھی ناسٹلجیا اسی قسم کے خدشات کی صورت میں پیدا ہوتا ہے۔ جو ایک ایسے ڈروخوف کی نشاندہی کرتا ہے جس کی کوئی شکل وصورت نہیں۔ عموماً انسان کو جب کوئی مسئلہ درپیش ہو تو ایک ممکنہ ڈر اپنی شکل کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ جس سے انسان نبرد آزما ہو سکتا ہے۔ لیکن جب ایک ساتھ بیسوں مسائل آن گھیریں تو ڈر اور خوف ایک بے چہرگی کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ برطانیہ میں طرح طرح کے مسائل سے ہر روز تارکینِ وطن کو سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جن میں بے یقینی اور لاتعلقی کا خوف شدید تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ جس کی ترجمانی علی ارمان کی شاعری میں ملتی ہے لیکن مجموعی طور پر ایسے اشعار حال حال ہی ہیں۔

روز ملتا ہے صورت بدل کر مجھے
ایک ڈر جس کا کوئی بھی چہرا نہیں(۷۲)

۱۰۔ بیرونی ہجرتیں:

اردو شاعری میں ہجرت اور بے زمینی کا موضوع آغاز سے ہی رہا ہے جس کا ذکر باب اول میں تفصیلی کیا گیا ہے۔ اس مسافت نے شعراء میں داخلی سطح پر کٹاؤ پیدا کیا ہے۔ عموماً ہجرت دو طرح کی ہوتی ہے ایک تو اختیاری اور

دوسری وقت کے جبر کا نتیجہ ہوتی ہے۔ دونوں صورتوں میں تارکینِ وطن اپنے وطن میں گزرے خوشگوار دنوں کو یاد کرتے ہیں۔ تقسیم ہند کے نتیجے میں کی گئی ہجرت بعض صورتوں میں اختیاری اور بعض صورتوں میں وقت کا جبر تھا۔ جس کے دیرپا اثرات ہوئے۔ آزادی کے بعد شاعری میں سفر باقاعدہ استعارہ برتا جانے لگا۔ حال سے بیزار ہونے والوں کو مستقبل تاریک دکھائی دینے لگا۔ اس مستقبل کے لیے رات کا استعارہ برتا گیا۔ لیکن سقوط ڈھاکہ کے بعد دن کے جبر کا ذکر ملتا ہے۔ جو رات سے بھی شدید تر تھا۔ جس کے بعد سفر کا ایک سلسلہ چل نکلا۔ جو شعراء میں ناسٹلجیا کی صورت میں وقوع پذیر ہوا۔ عدنان بشیر رقمطراز ہیں:

> ''سفر کا استعارہ آزادی کے بعد ہی شاعری میں زیادہ شدت سے آیا اور ایک مسلسل سفر کی کیفیت میں شاعری سفر کرنے لگی۔ اس سفر میں ان بستیوں کی یادیں مسلسل تعاقب میں ہیں جن سے ہجرت کرکے یہ لوگ نکلے لیکن ان ہجرتوں کے مقدر میں بھی اب کوئی قریہ معتبر نہ تھا جہاں یہ لوگ اپنا راہوار روک کے سکھ کا سانس لیتے۔''(۴۳)

مذکورہ بالا اقتباس کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو اس سفر کا سلسلہ کسی خاص منزل پر تھما نہیں۔ موجودہ عہد میں پاکستانی تارکینِ وطن کی ایک بڑی تعداد معاشی آسودگی کے سلسلے میں دیارِ غیر کا رخ کر رہی ہے۔ جس میں خلیجی ریاستوں کے ساتھ مغربی ترقی یافتہ ممالک بھی شامل ہیں۔ جہاں کی نئے معاشرت میں ان کی مادی آسائشیں تو پوری ہو جاتی ہیں لیکن وجود میں کوئی کمی رہ جاتی ہے۔ جو حال سے بیزاری کا موجب بنتی ہے۔

پاکستان کے نامساعد حالات دن بہ دن ابتر ہوتے جا رہے ہیں۔ معاشی پستی نے ملک میں بیرروزگاری کو بڑھا دیا ہے۔ نوجوان نسل ڈگریوں کے پلندے ہاتھوں میں لیے دفتر دفتر کا چکر کاٹتے ہیں۔ لیکن ملک میں روزگار کے مواقع نہ ہونے کے برابر ہیں۔ عموماً نوجوانوں میں ناامیدی کی فضا دکھائی دیتی ہے۔ یہ ناامیدی ان کو ملکی حالات سے بیزار کر دیتی ہے۔ اس بیزاری کی وجہ سے نوجوانوں کی اکثریت ترقی یافتہ ممالک کا رخ کرتی ہے۔

احمد مشتاق کی شاعری میں غمِ جاناں کے ساتھ ساتھ غمِ روزگار کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ اس بے روزگاری نے ہر طبقہ فکر کے لوگوں کو متاثر کیا ہے۔ مزدور سے لے کر بڑے سے بڑا سرمایہ دار ملک میں محنت کرنے اور پیسہ لگانے سے کتراتا ہے۔ وہ اس بھوک اور افلاس میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھ سکتا۔ اگر وہ ملک میں محنت بھی کرتا ہے تو سوائے روٹی اور چھت کے کچھ نہیں کما سکتا۔ کرونا وائرس کے دنوں میں مزدوروں کی دھاری لگانا تک بند ہو گئی تھی۔ اچھے اچھے تاجروں کے کاروبار اور گھرانے بیٹھ گئے۔ عصر حاضر کا انسان جس عہد میں زندہ ہے اس

میں روٹی اور مکان کے سوا انسان کی ہزار طرح کی خواہشات ہیں۔ احمد مشتاق ملکی حالات پر گہری نگاہ رکھے ہوئے ہیں۔ ان کے نزدیک بھی ملکی فضا میں سوائے آب و دانہ کے کچھ نہیں بچا۔ جبکہ آب و دانہ زندگی جینے کے لیے کافی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گاؤں گاؤں، شہر شہر، محنتی لوگوں سے خالی ہو چکے ہیں۔ سبھی لوگ ترقی یافتہ ممالک میں منتقل ہو چکے ہیں۔

ہو گیا شہر پرندوں کی صدا سے خالی
پیٹ بھرتے ہیں کہیں آب و ہوا سے خالی [۷۴]

ترقی یافتہ ممالک میں منتقلی کے بعد دیارِ غیر میں ہزار طرح کے مسائل سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ ایک مدت کے بعد فرد وہاں کی سوسائٹی میں جگہ بنانے میں کامیاب ہوتا ہے۔ جو اس کے دل کی خواہشات کے عین مطابق ہوتی ہے۔ لیکن پھر بھی کبھی کبھی وہ اپنوں کی کمی کو محسوس کرتا ہے۔ یہ کمی اس میں ناسٹلجیائی جذبات پیدا کرتی ہے۔ یہ فضا اسے اپنی طرف کھینچتی ہے۔ وہ واپس وطن پلٹنا چاہتا ہے لیکن ملک کے حالات اسے دیارِ غیر میں ہی رہنے پر مجبور کرتے ہیں۔

دل نے کچھ بستیاں بسائی ہیں
کاش انہی بستیوں میں رہ جاؤں [۷۵]

تلاش روزگار میں آبائی علاقوں سے باعثِ مجبوری بیرون ممالک ہجرت کرنے والے تارکین کی ایک خاصی تعداد برطانیہ میں مقیم ہے۔ برطانیہ ترقی یافتہ ممالک کی صف میں آتا ہے۔ جہاں کا ویزہ حاصل کرنا ہر دوسرے شخص کی دلی خواہش ہوتی ہے۔ ہر شخص بلندی کی طرف سفر کرنا چاہتا ہے۔ برطانیہ جیسا ملک اس بلندی کو حاصل کرنے کے لیے سازگار ہے۔ بظاہر اس بلندی کا رستا طے کرنا آسان معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ مسافت طے کرنا پہاڑ کا رستہ معلوم ہوتا ہے۔ جہاں دوران سفر گز دو گز کی مسافت پر نئے نئے موڑوں سے سامنا ہوتا ہے اور تنگ و تاریک گھاٹیوں سے گزرنا پڑتا ہے جو ایک طرح کے مشکل مزاج رستے ہیں۔

اتنی کوئی زیادہ مسافت نہیں مگر
مشکل مزاج ہوتے ہیں رستے پہاڑ کے [۷۶]

راستے کے بڑے مسائل ہیں
مجھ سے کچھ پوچھتے تو بہتر تھا [۷۷]

اس بیرونی ہجرت کا ایک مقصد تتلیوں اور پریوں کا تعاقب بھی ہے۔ یہ تعاقب انجان باغوں اور طلسماتی پرستانوں کی سیر کرواتا ہے۔ جہاں کی دنیا مصنوعی ہے۔ ان تتلیوں اور پریوں کے تعاقب میں جانے والے آدمی عموماً

گھر کا رستا بھول جاتے ہیں۔ منصور آفاق بھی انہیں آدمیوں کی آنکھ میں ان حسین خوابوں کو دیکھ رہے ہیں جو تتلیوں کے تعاقب میں برطانیہ میں جانے کے خواہاں ہیں یا جو جا چکے اور لوٹے نہیں۔

میں تتلیوں کے تعاقب میں جانے والا ہوں
کسی نے ماتھے پہ بوسہ دیا تو اس نے کہا (۷۸)

علی ارمان کی شاعری میں مسلسل ہجرت کا عنصر ملتا ہے۔ تاریخِ انسانی پر نگاہ دوڑائیں تو انسان اب تک ہجرت کا سفر طے کر رہا ہے۔ جو تمام ہونے کا نام نہیں لے رہا۔ برصغیر میں ہجرت اپنا ایک پس منظر رکھتی ہے جس کا مذکورہ باب میں جابجا ذکر ملتا ہے۔ ایک مثالی ریاست کا خواب جب چکنا چور ہوا اور معاشی حوالے سے ملک کمزور پڑا تو پاکستان سے ایک بڑے طبقے نے بیرونی ہجرتوں کو گلے لگانے کو غنیمت جانا۔ دیارِ غیر ہجرت کے بعد بھی پاکستانی تارکینِ وطن کو روشنی کا پتا معلوم نہ ہو سکا۔ انہیں اندھیرا ہی اندھیرا دکھائی دیتا ہے۔ ایسے حالات میں ان کے ہاں ایک طرح کی قنوطیت پیدا ہوئی ہے۔ جو انہیں ازلی وابدی سفر کی طرف توجہ دلاتی ہے۔ جس میں آدمی کی کہانی میں ہجرت اس کا مقدر معلوم ہوتی ہے۔ جس کا سفر ایک نہ ختم ہونے والے کرب وجوار کی شکل اختیار کر جاتا ہے۔

سفر میں ہے کہانی آدمی کی
مسلسل کوئی ہجرت ہو رہی ہے (۷۹)

۱۱۔ اکتاہٹ:

تارکینِ وطن کو ترقی یافتہ ممالک میں صنعتی ترقی کا حصہ بننا پڑتا ہے۔ بالخصوص مغربی ممالک برطانیہ کی زندگی مصروف ترین زندگی ہے۔ وہاں سارا سارا دن مشینوں کے ساتھ کام کرتے ہوئے انسان مشین کا پرزہ بن چکا ہے۔ گویا انسان مشین کی طرح جذبوں سے عاری ہو چکا ہے۔ وہ معمول کی زندگی سے اکتا چکا ہے۔ وہ زندگی تو زندگی ،خود سے بھی کہیں دور بھاگنا چاہتا ہے۔ ایسی جگہ جہاں اس کے قلب وروح کو سکون حاصل ہو سکے۔ یہ اکتاہٹ ناسٹلجیا کا سبب ہے۔

دل جذبات و احساسات کا محور ہوتا ہے۔ وہ دوسروں کے لیے دردِ دل اور خوشی کے جذبات رکھتا ہے۔ دوسروں کے کرب وجوار میں بین کرتا اور خوشی میں دھمال ڈالتا ہے۔ لیکن احمد مشتاق ترقی یافتہ ممالک کے اس دل کا حال واحوال بیان کرتے ہیں جو ترحم اور خوشی کے جذبات سے عاری ہو چکا ہے۔ مشینی دنیا میں یہ دل بے حس بن چکا ہے۔ جس کو کسی شخص سے کسی قسم کا کوئی سروکار نہیں۔ زلف یار کا سایہ تو دور کی بات، دنیا کے حسین موسم تک اسے نہیں بھاتے۔

دل نہ اچھا ہو تو کچھ بھی نہیں اچھا لگتا

سایہ گیسوئے دلدار نہ اچھا موسم (۸۰)

روزمرہ کے معاملات سے شاعر کے ہاں تنگیِ دل پیدا ہو گئی ہے۔ جو لوگوں سے بیزاری کا سبب بن رہی ہے۔ اس اکتاہٹ میں وہ ایک ایسا مکاں آباد کرنی کی بات کرتا ہے، جہاں بے حس لوگوں کا شور و غل سنائی نہ دے۔

چلو ایسا مکاں آباد کر لیں

جہاں لوگوں کی آوازیں نہ آئیں (۸۱)

ساقی فاروقی کی شاعری میں دنیا سے ناراضگی کا اظہار ملتا ہے۔ دکھ و تکلیفوں میں زندگی بسر کرنے کے بعد بھی انسان کا لاحاصلی مقدر ٹھہرے تو دنیا سے بیزاری اور ناراضگی سمجھ میں آتی ہے۔ خاص کر یہ احساس تارکینِ وطن میں اس وقت گہرا ہوتا ہے جب مشرقی آدمی لاکھ تگ و دو کے باوجود یورپ کی سرزمین میں خوش حال زندگی بسر کرنے میں ناکام ثابت ہوتا ہے۔ یورپ اور بالخصوص برطانیہ جیسے معاشرے میں زندگی کی ہر آسائش موجود ہے۔ لیکن پاکستانی تارکینِ وطن کو یہ رنگینیاں اور آسائشیں دیرپا متاثر نہیں کر پاتی۔ انہیں ہزاروں طرح کے وسوسے اور مسائل گھیرے میں لے لیتے ہیں۔ جو ان میں شدید قسم کی سے اکتاہٹ پیدا کر دیتے ہیں۔ ساقی فاروقی نے برطانیہ میں عیش و عشرت کی زندگی بسر کی ہے۔ ہر طبقے کے لوگوں کے ساتھ ان کا اٹھنا بیٹھنا رہا ہے۔ ایسی بھرپور زندگی جو ایک مشرقی شخص کا خواب ہوتا ہے۔ یقیناً انہیں وہاں کے معاشرے میں لاکھوں مسائل کا بھی سامنا کرنا پڑا ہو گا۔ لیکن بھرپور زندگی کے باوجود وہ اکتاہٹ میں دنیا سے کنارہ کشی کر کے اپنے ویرانے میں جا بیٹھنے کو ترجیحی دیتے ہیں۔ یہ ویرانہ ان کا ماضی ہے۔ جو انہیں راحت و سکون دیتا ہے۔

عمر بھر کانٹوں میں دامن کون الجھاتا پھرے

اپنے ویرانے میں آ بیٹھا ہوں *دنیا دیکھ کر* (۸۲)

منصور آفاق کی شاعری میں بھی زندگی سے اکتاہٹ ملتی ہے۔ وہ مادی زندگی کی دلکشیوں اور رعنائیوں سے تنگ دکھائی دیتے ہیں۔ برطانیہ کے ماحول میں تو یہ احساس مزید گہرا ہے۔ مغربی طرز معاشرت میں عیش و عشرت کی نذر ہوتے ہوئے لوگ زندگی کی حقیقت سے ناآشنا ہیں۔ لیکن تارکینِ وطن دوران قیام وہاں کے ماحول سے اکتا جاتے ہیں۔ یہ اکتاہٹ ان میں زندگی سے بیزاری کو پیدا کرتی ہے۔ منصور زندگی کے لیے ایک ایسی لڑکی کا استعارہ استعمال کرتے ہیں جو لمحہ لمحہ رنگ اور تعلقات کو بدلتی ہے۔ اور اس کا چراغ کب اور کہاں گل ہو جائے اس کا بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔

زندگی نام کی ہے اک لڑکی
واجبی سی ہے بے وفاسی ہے (۸۳)

اس اکتاہٹ میں وہ جب دنیا سے بیزار ہو جاتے ہیں تو ان کو کائنات بہت چھوٹی دکھائی دینے لگتی ہے۔ یہ کائنات گویا ایک قفس معلوم ہوتی ہے۔ جس میں ایسے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے انسان قید و بند کی صعوبتیں برداشت کررہا ہو۔ اس قید میں گھٹن کا احساس ہوتا ہے۔ وہ رہائی چاہتا ہے۔ ایسی رہائی جو اسے سکون فراہم کرے۔ یہ سکون ناسٹلجیائی جذبات کو پیدا کرتا ہے۔

تری کائنات میں قید ہوں بڑے مختصر سے قفس میں ہوں
بڑی سنگ زاد گھٹن سی ہے مجھے کوئی اس سے رہا کرے (۸۴)

۱۲۔ اپنوں کی جدائی کا دکھ:

آبائی وطن سے دوری اختیار کرنے کے لیے کلیجہ چاہیے۔ مختلف صورتِ حال کے پیشِ نظر لوگ دل پر پتھر رکھ کر دور دراز علاقوں کا سفر کرتے ہیں۔ ان دور دراز علاقوں میں جب بات سات سمندر پار کی ہو رہی ہو تو تارکینِ وطن کے لیے ہمدردی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ اجنبی ملکوں میں انہیں ہزار طرح کے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بالخصوص تہواروں، شادی بیاہ کی تقاریب، خوشی اور غمی میں انہیں قدم قدم پر اپنوں کی جدائی کا احساس ہوتا ہے۔

احمد مشتاق کی شاعری میں اپنوں کی جدائی کا کرب جابجا ملتا ہے۔ انہوں نے عمر کا ایک بڑا حصہ دیارِ غیر میں صرف کیا ہے۔ دیارِ غیر کی مصروف زندگی میں انسان کے جذبات و احساسات کی قدر و منزلت نہ ہونے کے برابر ہے۔ وہاں اپنوں کی جدائی کا فراق ناقابل برداشت ہے۔ لیکن اگر وہ دنیا کے رسم راہ میں کبھی کبھار اپنوں کو بھول جائیں یا دن کی مصروفیات میں اپنوں کو یاد کرنے کا وقت نہ ملے یا وہ خود بھولنا چاہے، تو شام ہوتے ہی دل میں عہدِ رفتگاں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

میں نے دل سے کہا ہم جھیل گئے ہجر کا دن
دل نے چپکے سے کہا *شام ذرا ہونے دو* (۸۵)

اپنوں کی یادیں شاعر کو گزرے ہوئے زمانوں کے کوچہ و بازار، قریہ و شہر اور نجانے کن دیاروں اور یادوں کے جزیروں میں لیے پھرتی ہے۔ احمد مشتاق جگنوؤں کو روشنی کے استعارے کے طور پر برتتے ہیں۔

گویا ایسے احباب کی سمت اشارہ کرتے ہیں جو درست ڈگر پر لگا کر خود یاد کے جنوب کو چل دیے۔ جبکہ تتلی کو نرم وناز کی اور جمالیات کا استعارے کے طور پر برتتے ہیں۔ گویا ایسی انبساط جو روح کی تازگی کا ساماں تھی۔ جبکہ شمال اور جنوب کو ایک معلوم سمت کے طور پر برتا گیا ہے۔ جو کہیں یاد کے گوشوں میں پنہاں ہے۔

یہ ہوائے قریہ رفتگاں لیے پھر رہی ہے کہاں کہاں
کبھی جگنوؤں کے جنوب میں کبھی تتلیوں کے شمال میں (۸۶)

ساقی فاروقی کی شاعری میں اپنوں سے جدائی اور ہجرت کا عمل اختیاری معلوم ہوتا ہے۔ جس پر وہ شرمندہ اور نالاں دکھائی نہیں دیتے ۔ خوابوں اور آسائشوں کے تعاقب میں کی گئی ہجرتوں پر وہ بین اور تماشابینی نہیں کرتے۔ لفظ " مرضی " ایک نیا پہلو سامنے لاتا ہے۔ اس نئے پیرائے اظہار سے وہ برطانیہ منتقل ہونے والے لوگوں کے اس معاشرتی رویے پر طنز کرتے ہیں جو ایک طرح کا دکھاوے پر مبنی ہے۔ جس پر وہ پریشان بنے پھرتے ہیں۔ اس اختیاری ہجرت کو ساقی یاد کرتے ہیں جس کے پس پشت بہت سے عوامل کارفرما تھے۔

خاک میں اسکی جدائی میں پریشان پھروں
جب کہ یہ ملنا بچھڑنا مری مرضی نکلا (۸۷)

منصور آفاق کی شاعری میں ہجر کی رات سلوموشن دکھائی دیتی ہے جو کئی صدیوں پر محیط ہے ۔ سات سمندر پار تن و تنہا زندگی گزارنا بازیچہ اطفال نہیں۔ وہاں اپنوں کی جدائی کا احساس شدت سے ہوتا ہے۔ ملن کی ایک آس ہر وقت پہلو میں چنگاری جلائی رکھتی ہے۔ یہ انتظار کی گھڑیاں قیامت سے کم نہیں معلوم ہوتی۔

رات ہجراں کی، سلوموشن میں صدیاں پر محیط
دن جدائی کا کہیں، جیسے ابد کا انتظار (۸۸)

اس انتظارِ شب میں انہیں ہجراں کی شام رہ رہ کر یاد آتی ہے۔ جدائی کا لمحہ ایسا دردناک ہوتا ہے کہ حوصلہ مند شخص ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے۔ لیکن جب جدائی اپنوں سے ساتھ سمندر پار کے لیے ہو رہی ہو تو یہ ساعت ناقابل بیاں ہے۔ آنکھیں چشمِ یعقوب ہو جاتی ہیں۔ انسان ہاتھ ملتا رہ جاتا ہے۔ منصور آفاق اس گھڑی کو یاد کرتے ہوئے آبدیدہ ہو جاتے ہیں۔

وہ ساعتِ جدائی وہ ہجراں نگر وہ شام
اس دل میں حوصلہ تو بہت تھا مگر وہ شام (۸۹)

میں رہ گیا تھا سٹیشن پہ ہاتھ ملتے ہوئے
مگر یہ کیسے کہانی سے دو منٹ جائیں (۹۰)

برطانیہ مادی آسائشوں اور رنگینیوں کا مرکز ہے۔ لیکن ایسی آسائشوں اور رنگینیوں کا کوئی کیا کرے جب اس کے اپنے اس سے دور ہوں۔ ایسے حالات میں یہ آسائشیں اور رنگینیاں مانند پڑھ جاتی ہیں۔ برطانیہ جیسا ملک بھی اسے قید خانہ معلوم ہوتا ہے۔

میں برمنگھم قید رہا
وہ اسلام آباد رہے (۹۱)

علی ارمان کی شاعری میں اپنوں کے وصل کی ایک امید دکھائی دیتی ہے۔ ہجر کی رات کتنی ہی سیاہ و تاریک کیوں نہ ہو، رات تو پھر رات ہوتی ہے، جس کی صبح وصل کی صبح ہوتی ہے۔ دیارِ غیر میں انہیں اپنے دوست احباب کی جدائی کا شدت کے ساتھ احساس ہوتا ہے۔ لیکن ان کی طرف سے ملنے والی محبتیں یادوں کا سرمایہ ہے۔ جو ہجر کا کڑا وقت بیتانے کا ساماں ہیں۔ یہی یادیں انہیں قوت و طاقت فراہم کرتی ہیں۔ یہ یادیں ایک طرح ملاقات کا کام کرتی ہیں۔

اب تک مجھے دیتے ہیں ترے وصل کی خوشبو
کب ہجر سے ہارے ہیں ترے وصل کے تحفے (۹۲)

۱۳۔ دوستوں کی یادیں:

تارکینِ وطن مختلف وجوہات کی بنا پر دور دراز علاقوں کا سفر اختیار کرتے ہیں۔ ان ممالک میں انہیں بہترین سہولیات سے آراستہ زندگی میسر آتی ہے۔ چونکہ یہ ممالک ترقی یافتہ ہوتے ہیں چنانچہ مادی آسائشوں کی تسکین کا سبب بنتے ہیں۔ یہاں کی زندگی مصروف زندگی ہوتی ہے۔ جہاں وقت کی کمی کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔ اگر وقت میسر آ بھی جائے تو دردِ دل بیان کرنے کے لیے کوئی بندہ میسر نہیں آتا۔ ایسے ماحول قیامِ پاکستان کے وقت بھی دیکھنے کو ملا تھا۔ جو رفتگاں کی تلاش میں گلیوں، کوچوں اور شہر کے چوراہوں پر مارے مارے بھٹکتے تھے۔ جس کے بارے ناصر کاظمی رقمطراز ہیں:

> ”رات کی خاموشی میں جمع ہونے والے یہ ہمعصر اپنی آنکھوں میں رفتگاں کے خواب اور مستقبل کا سورج لے کر گھر سے نکلتے تھے اور لاہور کے چائے خانوں، کتب خانوں اور گلیوں میں ستاروں کی طرح گردش کرتے نظر آتے تھے۔“ (۹۳)

احمد مشتاق دوہری ہجرت کے کرب سے گزرے ہیں۔ تقسیم کے وقت بھی وہ امرتسر کے دوستوں کو لاہور کی گلیوں، سڑکوں اور چورہوں پر تلاش کرتے ہیں۔ یہ تلاش ان کو حال سے بیگانہ کر دیتی ہے۔ جو ماضی کی حسین

یادوں پر جا کر ختم ہوتی ہے۔ وہ ان یادوں سے اپنے دوست احباب کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ وہ انہیں ایام کی داستان شعر میں قلمبند کرتے ہیں۔ اس کھوج کی جستجو نہ صرف ان کی شاعری میں پائی جاتی ہے بلکہ اس وقت کے دیگر شعراء کی تخلیقوں میں بھی جلوہ گر ہے۔

یار سب جمع ہوئے رات کی تاریکی میں

کوئی رو کر تو کوئی بال بنا کر آیا (۹۴)

دیارِ غیر میں ہجرت معاشی آسودگی کی خاطر کی گئی۔ نقل مکانی نے ان کے دامن کو مزید داغ دار کر دیا ہے۔ عموماً یہ تجربے میں آتا ہے کہ کسی شخص کے ماتحت کام کرنا اپنی انا کو مارنے کے مترادف ہوتا ہے۔ جس پر کسی شاعر کا سمجھوتا کرنا دشوار گزار عمل ہے۔ احمد مشتاق کارِ دنیا میں فراغت کے دنوں کو یاد کرتے ہیں۔ جب دوستوں یاروں کی ٹولیوں کا ہجوم ہوتا تھا۔ لیکن فراغت کے لمحوں پر کارِ دنیا کو ترجیح دیتے ہیں۔ کیوں کہ فراغت کے لمحات میں دوستوں کی یادیں ان کے دامن پر لگے زخم کو چاک کر دیتی ہیں۔ جو کہ ایک تکلیف دہ عمل ہے۔

بہت شفاف تھے جب تک کہ مصروف تمنا تھے

مگر اس کارِ دنیا میں بڑے دھبے لگے ہم کو (۹۵)

منصور آفاق کی شاعری میں دوستوں کی یادیں تلخ دکھائی دیتی ہیں۔ عموماً تنگیِ حالات میں دوست احباب ایک دوسرے کی امیدوں پر پورے اترتے ہیں لیکن منصور کا تجربہ اس حوالے سے اچھا نہیں رہا۔ انہیں دوست احباب، دشمن معلوم ہوتے ہیں جو کسی کی مدد تو دور کی بات، اس کے رستے میں ہزار طرح کے روڑے اٹکاتے ہیں۔ عموماً برطانوی سماج میں دوہرے معیار کے لوگ ملتے ہیں۔ جہاں محبت و خلوص کم کم دکھائی دیتا ہے۔ پردیس میں اجنبی تو اجنبی کسی دوست یار پر بھی اعتبار کرنا آسان نہیں ہوتا۔ تارکینِ وطن کو دوست احباب کی بے اعتنائی اس وقت شدت سے محسوس ہوتی ہے جب انہیں پرائے لوگوں سے محبت ملتی ہے۔

دیکھوں کہیں خلوص تو آتی ہے ذہن میں

پیچھے سے وار کرتے ہوئے دوستاں کی یاد (۹۶)

منصور آفاق محبت و خلوص ملنے کے باوجود پردیس میں دوست احباب کو تلاش کرتے ہیں۔ دوست کیسا ہی کیوں نہ ہو، ہوتا تو دوست ہی ہے۔ منصور ہوا کے دوش پر منزلِ دوستاں کا پتا تلاش کرتے ہیں۔ ہوا رابطے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ عصرِ حاضر میں جہاں جدید ٹیکنالوجی نے دیگر شعبہ ہائے زندگی میں ترقی کی ہے وہی رابطے کے میدان میں سمارٹ فون اور دیگر ایپ کو متعارف کروایا ہے۔ یہ رابطہ ہوا میں سگنل کی بدولت ممکن ہوتا ہے۔ دیارِ غیر میں بھی وہ سمارٹ فون کے ذریعے دوستوں کے ساتھ رابطے میں ہیں۔

کس طرف دوستوں کی منزل ہے
کچھ ہوا سے مشاورت کرلیں (۹۷)

۱۴۔ عہد طفلی کی یادیں:

آبائی وطن سے محبت انسانی سرشت میں شامل ہے۔ وہ جس خطے میں پیدا ہوتا ہے۔ اس سے بے لوث محبت اس کے خمیر میں گوندھی ہوتی ہے۔ یہ بے لوث پن اس وقت شدت اختیار کرتا ہے۔ جب بچپن، لڑکپن اور جوانی کا ایک بڑا حصہ آبائی وطن میں گزارتا ہے مگر اچانک النوع وجوہات کی بنیاد پر آبائی وطن سے دوری اختیار کرنی پڑجائے۔ تب یہ فراق وبال جان بن جاتاہے۔ غیر ممالک کی معاشرت ان کی تہذیب وتمدن، ثقافتی رنگ، اقدار وروایات اور طرزِ زندگی مختلف ہوتی ہے۔ جس میں تارکینِ وطن ایک مدت تک اپنائیت محسوس نہیں کرپاتے۔ یہ احساس محرومی ان میں ناسٹلجیائی جذبات کو تقویت بخشتے ہیں۔ دیارِ غیر میں تارکینِ وطن کو بچپن کی یادیں خوب ستاتی ہیں۔ دوستوں کے ساتھ کھیل کود، گلیوں، کوچوں اور بازاروں کی دل کش رونقیں، مذہبی، علاقائی اور قومی تہواروں، میلوں ٹھیلوں، اور بالخصوص عہدِ طفلی میں پیدا ہونے والے جذبات واحساسات کی بنیادوں پر قائم تعلقات ناقابلِ فراموش ہوتے ہیں۔ عموماً دیکھا گیاہے کہ تارکینِ وطن کی گفتگو میں آبائی وطن میں گزرے بچپن کے دنوں کی یادیں زیر بحث آتی ہیں۔

مغربی ممالک بالخصوص برطانیہ کی طرزِ معاشرت میں تمام تر مادی سہولتیں اور آسائشیں موجود ہیں۔ یہاں کا سماجی نظام، نفسانفسی اور مفاد پرستی سے عبارت ہے۔ اس معاشرے نے انسانی جذبات واحساسات اور مروت کو کچل دیا ہے۔ انسان مشین بن چکا ہے۔ یہاں وقت گزرنے کا احساس تک نہیں ہوتا۔ یہ معاشرہ بارونق ہونے کے باوجود بے رونقی سے عبارت ہے۔ ایسے ماحول میں شدتِ تنہائی اور افسردگی کی فضا پیدا ہوتی ہے۔ جبکہ پاکستان کا سماجی ڈھانچہ گوناگوں محرومیوں کے باوجود اعلیٰ انسانی اقدار اور روحانی ترقی کا حامل ہے۔ جہاں پر گزرتے شب روز وقت کے گزرنے کا احساس دلاتے ہیں۔ یہاں کی رونقیں اور دل کشیاں دل کو مولیتی ہیں۔ پس یہی وجہ ہے کہ دیارِ غیر منتقل ہونے والے تارکین اپنے ماضی کے شب وروز اور عہدِ طفلی کی یادوں میں گم گشتہ دکھائی دیتے ہیں۔

طفلی کے دنوں میں عموماً دیکھا گیا ہے کہ بچے اس شخص سے زیادہ رغبت رکھتے ہیں جو ان سے شفقت ومہربانی سے پیش آتا ہے۔ ایسا شخص ناقابلِ فراموش ہوتا ہے۔ احمد مشتاق کی شاعری میں طفلی کے دنوں میں اپنے بزرگوں کی طرف سے ملنے والی بے پناہ محبت و شفقت کا ذکر نمایاں ہے۔ دیارِ غیر کی زندگی میں محبت و شفقت کا فقدان ہے۔ وہاں کی زندگی میں کارِ تمنا میں مصروف انسان کو کھانے پینے کا ہوش تک نہیں ہوتا۔ وہاں کی معاشرت

میں تن و تنہا رہنے کا تصور ہے۔ پاکستانی معاشرت کی طرح خانگی نظام نہیں ہے۔ اس لیے کام کاج کے بعد کھانے پینے کا انتظام بھی خود ہی کرنا پڑتا ہے۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ انسان تھکن سے چور بھوکے پیٹ سونے کو ترجیح دیتا ہے۔ اس کے علاوہ دیارِ غیر میں علالت کے ایام میں کوئی عیادت تک کے لیے نہیں آتا۔ انسان مرے یا جیے اس سے کسی کو کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ احمد مشتاق اس بے خانگی نظام میں اپنے بزرگوں کی محبت و شفقت، مشرقی خانگی نظام اور اپنی تہذیب و ثقافت کو یاد کرتے ہیں۔

وہ جن دنوں میں کرم بے حساب تھا تیرا
وہی تو دن تھے مرے کھیلنے کے کھانے کے (۹۸)

مشرقی خانگی نظام گوناگوں مسائل کے ہمراہ لاتعداد فوائد سے عبارت ہے۔ جن فوائد کا احساس دیارِ غیر میں منتقلی کے بعد تارکین وطن کو شدت سے ہوتا ہے۔ جہاں مشینی زندگی میں انسان پرزے کی طرح ساٹھ سال تک کارِ جہاں سرانجام دیتا ہے لیکن جوں ہی ریٹائرڈ ہوتا ہے تو اولڈ ہوم میں منتقل کر دیا جاتا ہے جہاں وہ اپنی زندگی کے باقی ایام تن و تنہا گزارتا ہے۔ ایسے حالات میں ناسٹلجیا پیدا ہوتا ہے۔ احمد مشتاق مشرق سے منتقل ہونے والے باشندوں کی اس کیفیت کو موضوع بناتے ہیں۔ جو غمِ روز گار اور کارِ تمنا کی تلاش اور خو میں پاکستان سے ہجرت کر کے مختلف ممالک میں جا آباد ہوئے ہیں۔ جہاں وہ مشرقی خانگی نظام اور بالخصوص بچپن کے اس عہد کو یاد کرتے ہیں جہاں سب مل جل کر محبت سے ایک ساتھ رہتے تھے۔

اک زمانہ تھا کہ سب ایک جگہ رہتے تھے
اور اب کوئی کہیں کوئی کہیں رہتا ہے (۹۹)

عہد طفلی بے فکر، کیف و مستی، جزب سے معمور، مسرتوں اور خواہشوں سے لبریز ہوتا ہے۔ بچپن کا جگنو، تتلیوں کا تعاقب، کاغذ کی کشتی، کھیت کھلیان میں پرندوں کو ڈرانا، آنکھ مچولی، میلوں ٹھیلوں میں پتلی تماشا اور آبائی گلے کوچے عمر کے ہر حصے میں یاداشتوں کا حصہ رہتے ہیں۔ ہر شخص کا بچپن موج مستی میں گزرا ہوتا ہے۔ شاعری میں اس معصومیت کا سچا اظہار اپنے بھرپور کیفیات کے ساتھ امیجری میں ملتا ہے۔ پردیس میں بچپن کی یادیں آب و تاب سے آتی ہیں۔ منصور آفاق بچپن کی سنہری یادوں کو باغ بہشت قرار دیتے ہیں۔ وہ ان دنیاؤں سے باہر نہیں آنا چاہتے۔ وہ خواہش کرتے ہیں کہ وقت رک جائے۔ لیکن وقت سفاک قاتل ہے۔ جو بیتا ہی چلا جا رہا ہے۔

کاش بچپن کی بہشتوں سے نہ باہر آؤں
روک لے عمر کے دریا کا کٹاؤ کوئی (۱۰۰)

بچپن کی عمر میں ملنے والی محبتیں انسان تاعمر نہیں بھولتا۔ اب تو وہ تہذیب بھی معدوم ہوتی جارہی ہے کہ جب چاند کو دیکھنے سربام جایا جاتا تھا۔ یہ چاند محبوب کا استعارہ ہے۔ جس سے ملاقات کا واحد ذریعہ چھت ہوتا تھا ۔جہاں سے محبوب کو ایک جھلک دیکھنے کے لیے دوپہر کی دھوپ میں ننگے پیر سارا سارا دن چھت پر گزارا جاتا تھا۔

چھت پہ چڑھ کے میں تمہیں دیکھ لیا کرتا تھا
تم نظر آتی تھی بچپن سے نمایاں جاناں[۱۰۱]

علی ارمان کی شاعری میں عہد طفلی کی معصومیت کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔ جس معصومیت کو وہ گھر سے لے کر برطانیہ کے سفر پر نکلے تھے۔ لیکن یہ بچپن غریب الوطنی کی نظر ہو گیا۔ غریب الوطنی کی جوانی بھی کیا خاک جوانی ہوا کرتی ہے۔ انسانی زندگی میں غم جاناں کے بعد تلاش معاش ایسا دکھ ہے جو نا قابل بیان ہے۔ یہ دکھ انسان کی جوانی کھا جاتا ہے۔ عصرِ حاضر میں کم عمری میں ہی نوجوانوں روشن مستقبل کے خواب آنکھوں میں سجائے تلاش معاش کے لیے اپنے گھر بار، دوست یار اور ملک کو خیر آباد کہتے ہیں۔ وہاں کے ماحول میں دن رات محنت کرتے ہیں ۔وہ موسموں کی حدتوں سے بے خبر ہوتے ہیں۔ یہ محنت ان کے جسموں کو جلا کرر کھ دیتی ہے۔ انہیں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ان کی جوانی جنم جنم سے اسی کرب میں گزر رہی ہے۔ ایسے میں ناسٹلجیائی کیفیات پیدا ہوتی ہیں۔ وہ اپنے بچپن کے حسین دنوں کو یاد کرتے ہیں جب کسی قسم کی کوئی فکر لاحق نہیں ہوتی تھی۔ جب ضروریات زندگی گھر کے بڑے پوری کر دیتے تھے۔

ملی تھی جنموں جلی جوانی رستے میں
ہم تو گھر سے بچپن اوڑھ کے نکلے تھے[۱۰۲]

حوالہ جات

۱۔ مشتاق احمد، مرتبہ، آدمی ہمارا (شعریاتِ احمد مشتاق)، پیس پبلی کیشنز، ص ۷۲، ۲۰۱۹ء

۲۔ احمد مشتاق، مجموعہ: احمد مشتاق، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ص ۶۰، ۲۰۲۱ء

۳۔ ایضاً، ص ۳۲

۴۔ ایضاً، ص ۱۶۹

۵۔ ایضاً، ص ۱۷۹

۶۔ ساقی فاروقی، سرخ گلاب اور بدر منیر (تمام نظمیں، تمام غزلیں)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ص ۲۷۰، ۲۰۰۵ء

۷۔ ایضاً، ص ۲۷۳

۸۔ منصور آفاق، دیوانِ منصور، وراق مرکز، لاہور، ص ۱۲۸، ۲۰۱۴ء

۹۔ ایضاً، ص ۲۷

۱۰۔ مشتاق احمد، آدمی ہمارا (شعریات احمد مشتاق)، مرتبہ، ص ۲۳، ۲۰۲۱ء

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۹۰

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۹۰

۱۳۔ ایضاً، ص ۲۲۰

۱۴۔ ایضاً، ص ۱۸۹

۱۵۔ احمد مشتاق، مجموعہ: احمد مشتاق، ص ۳۴۲، ۲۰۲۱ء

۱۶۔ ساقی فاروقی، سرخ گلاب اور بدر منیر (تمام نظمیں، تمام غزلیں)، ص ۲۳۳، ۲۰۰۵ء

۱۷۔ منصور آفاق، دیوانِ منصور، ص ۷۷، ۲۰۱۴ء

۱۸۔ ایضاً، ص ۱۳۲

۱۹۔ علی ارمان، مجھے چاند چاہیے، خزینہ علم وادب، لاہور، ص ۸۴، ۲۰۰۰ء

۲۰۔ ڈاکٹر شیر علی، برطانیہ میں اردو شاعری کی روایت (آغاز تا عصرِ حاضر) سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ص ۲۰۲، ۲۰۲۲ء

۲۱۔ احمد مشتاق، مجموعہ: احمد مشتاق، ص ۲۶۷، ۲۰۲۱ء

۲۲۔ ایضاً، ص ۲۷۶

۲۳۔ ساقی فاروقی، غزل ہے شرط، اکادمی بازیافت، ص ۲۰

۲۴۔ ساقی فاروقی، سرخ گلاب اور بدر منیر (تمام نظمیں، تمام غزلیں)، ص ۲۲۴

۲۵۔ ایضاً، ص ۲۱۸

۲۶۔ منصور آفاق، دیوانِ منصور، ص ۱۲۷

۲۷۔ ایضاً، ص ۲۳۳

۲۸۔ علی ارمان، مجھے چاند چاہیے، ص ۱۹۹

۲۹۔ احمد مشتاق، مجموعہ: احمد مشتاق، ص ۶۷

۳۰۔ ایضاً، ص ۱۸۸

۳۱۔ ایضاً، ص ۲۳۲

۳۲۔ منصور آفاق، دیوانِ منصور، ص ۱۳۰

۳۳۔ ایضاً، ص ۲۳

۳۴۔ علی ارمان، مجھے چاند چاہیے، ص ۱۱۰

۳۵۔ احمد مشتاق، مجموعہ: احمد مشتاق، ص ۲۶

۳۶۔ ایضاً، ص ۱۶۵

۳۷۔ ایضاً، ص ۹۲

۳۸۔ ایضاً، ص ۳۸

۳۹۔ ساقی فاروقی، سرخ گلاب اور بدر منیر (تمام نظمیں، تمام غزلیں)، ص ۲۱۷

۴۰۔ منصور آفاق، دیوانِ منصور، ص ۲۴۲

۴۱۔ ایضاً، ص ۶۵

۴۲۔ علی ارمان، مجھے چاند چاہیے، ص ۹۶

۴۳۔ اردو کی نئی بستیاں، ترتیب و تہذیب، گوپی چند نارنگ، ساہتیہ اکادمی، ص ۱۳۴تا۱۳۵، ۲۰۰۶ء

۴۴۔ احمد مشتاق، مجموعہ: احمد مشتاق، ص ۹۳

۴۵۔ ایضاً، ص ۳۶۵

۴۶۔ علی ارمان، مجھے چاند چاہیے، ص ۱۹۷

۴۷۔ احمد مشتاق، مجموعہ: احمد مشتاق، ص ۲۲۲

۴۸۔ ایضاً، ص ۲۴۰

۴۹۔ ساقی فاروقی، سرخ گلاب اور بدر منیر (تمام نظمیں، تمام غزلیں)، ص ۲۷۱

۵۰۔ منصور آفاق، دیوانِ منصور، ص ۲۵

۵۱۔ ایضاً، ص ۱۶

۵۲۔ احمد مشتاق، مجموعہ: احمد مشتاق، ص ۲۱

۵۳۔ مشتاق احمد، مرتبہ، آدمی ہمارا (شعریاتِ احمد مشتاق)، ص ۱۴۰

۵۴۔ احمد مشتاق، مجموعہ: احمد مشتاق، ص ۲۱

۵۵۔ ایضاً، ص ۱۸۰

۵۶۔ ساقی فاروقی، سرخ گلاب اور بدر منیر (تمام نظمیں، تمام غزلیں)، ص ۲۰۹

۵۷۔ ایضاً، ص ۲۱۷

۵۸۔ منصور آفاق، دیوانِ منصور، ص ۲۳۵

۵۹۔ ایضاً، ص ۱۲۳

۶۰۔ علی ارمان، مجھے چاند چاہیے، ص ۱۹۷

۶۱۔ مقیم الدین فاروقی، پاکستان کیوں ٹوٹا؟، کمیونسٹ پارٹی پبلی کیشن، دہلی، ص۱۸، ۱۹۷۲ء

۶۲۔ شیر علی، ڈاکٹر، برطانیہ میں اردو شاعری کی روایت (آغاز تا عصرِ حاضر)، ص۲۱

۶۳۔ احمد مشتاق، مجموعہ: احمد مشتاق، ص۵۱

۶۴۔ ایضاً، ص۱۷

۶۵۔ ایضاً، ص

۶۶۔ ایضاً، ص ۲۳۳

۶۷۔ ایضاً، ص ۱۱۴

۶۸۔ ساقی فاروقی، سرخ گلاب اور بدر منیر (تمام نظمیں، تمام غزلیں)، ص۲۳۱

۶۹۔ ایضاً، ص ۲۲۳

۷۰۔ منصور آفاق، دیوانِ منصور، وراق ی مرکز، لاہور، ص ۲۵

۷۱۔ ایضاً، ص ۹۵

۷۲۔ علی ارمان، مجھے چاند چاہیے، خزینہ علم و ادب، لاہور، ص ۸۰

۷۳۔ مشتاق احمد، مرتب، آدمی ہمارا (شعریاتِ احمد مشتاق)، ص ۲۱۳

۷۴۔ احمد مشتاق، مجموعہ: احمد مشتاق، ص ۲۳۰

۷۵۔ ایضاً، ص ۱۷۶

۷۶۔ ساقی فاروقی، سرخ گلاب اور بدر منیر (تمام نظمیں، تمام غزلیں)، ص ۲۴۳

۷۷۔ ایضاً، ص ۵۵

۷۸۔ منصور آفاق، دیوانِ منصور، ص ۳۶

۷۹۔ علی ارمان، مجھے چاند چاہیے، ص ۶۴

۸۰۔ احمد مشتاق، مجموعہ: احمد مشتاق، ص ۲۳۷

۸۱۔ ایضاً، ص ۴۴

۸۲۔ ساقی فاروقی، سرخ گلاب اور بدر منیر (تمام نظمیں، تمام غزلیں)، ص ۲۳۷

۸۳۔ منصور آفاق، دیوانِ منصور، ص ۲۷۳

۸۴۔ ایضاً، ۲۶۲

۸۵۔ احمد مشتاق، مجموعہ: احمد مشتاق، ص ۲۳۵

۸۶۔ ایضاً، ۲۳۲

۸۷۔ ساقی فاروقی، سرخ گلاب اور بدر منیر (تمام نظمیں، تمام غزلیں)، ص ۲۰۸

۸۸۔ منصور آفاق، دیوانِ منصور، ص ۱۱۸

۸۹۔ ایضاً، ص ۱۱۸

۹۰۔ ایضاً، ص ۱۲۲

۹۱۔ ایضاً، ص ۱۵۹

۹۲۔ علی ارمان، مجھے چاند چاہیے، ص ۱۶۷

۹۳۔ مشتاق احمد، مرتب، آدمی ہمارا (شعریاتِ احمد مشتاق)، ص ۲۳۷

۹۴۔ احمد مشتاق، مجموعہ: احمد مشتاق، ص ۶۶

۹۵۔ ایضاً، ص ۱۸۴

۹۶۔ منصور آفاق، دیوانِ منصور، ص ۷۷

۹۷۔ ایضاً، ص ۱۵۰

۹۸۔ احمد مشتاق، مجموعہ: احمد مشتاق، ص ۳۲

۹۹۔ ایضاً، ص ۱۸۰

۱۰۰۔ منصور آفاق، دیوانِ منصور، ص ۲۳۰

۱۰۱۔ ایضاً، ص ۱۴۵

۱۰۲۔ علی ارمان، مجھے چاند چاہیے، ص ۱۹۷

باب سوم:

پاکستانی تارکین وطن کی شاعری میں مراجعت کی خواہش (یادِ وطن) کے عناصر کا تجزیاتی مطالعہ

باب اول میں مراجعت کی خواہش کے بارے میں حاصل خواہ گفت شنید کی گئی ہے۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ ناسٹلجیا کا لفظ جوہانس ہافر نے ۱۶۶۸ء میں وطن واپسی کے طور پر متعارف کروایا۔ جوزف بنکس کے مطابق پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں اس لفظ کو بیماری کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ ایسی بیماری جو جنگ کے دوران یا حالتِ جنگ مریضوں کو لاحق ہو جاتی تھی۔ جس میں مریض گھر پلٹنے کی شدید خواہش میں مبتلا ہو جاتے یا دل شکستہ اور فسردہ ہو جاتے تھے۔ لیکن ادب میں اسے بیماری کی جگہ ماضی کی خواشگوار یا ناخواشگوار یادوں کی بازگشت اور مراجعت کی خواہش کے طور پر برتا جانے لگا۔

اردو شاعری میں ناسٹلجیا کا آغاز ولی دکنی سے ہوتا ہے جو مختلف ادوار سے ہوتا ہوا باقاعدہ تقسیم ہند کے سانحہ کے بعد تخلیق کاروں کے فن پاروں میں نظر آتا ہے۔ برصغیر میں تقسیم ہند کا سانحہ ایک بہت بڑا سانحہ تھا جس نے ہر طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو متاثر کیا۔ اس تقسیم میں ہونے والی ہجرت دنیا کی سب سے بڑی ہجرت تھی۔ جس میں لاکھوں لوگوں نے ملک کے ایک خطے سے دوسرے خطے میں ہجرت کی۔ اس ہجرت کے کرب سے لوگ ایک مدت تک نہ نکل سکے۔ یہ ہجرت نظریے کے پس پشت جغرافیائی بنیادوں پر کی گئی تھی۔ جس کے نتائج بعد میں سقوط ڈھاکہ کی صورت میں سامنے آئے۔ پاکستان بننے کے بعد درپیش مسائل نے لوگوں کو شدید مایوسی کا شکار کیا۔ اس مایوسی سے ادباء شعراء کے کلام اور تحریروں میں ناسٹلجیا در آیا۔

تقسیم ہند کے کچھ سالوں کے بعد ملک پاکستان میں جمہوریت پر شب خون مارنے کی ریت چل پڑی۔ ۱۹۵۸ء میں جزل ایوب خان نے ملک میں فوجی مارشل لاگا کر لوگوں کی مایوسی میں اضافہ کیا۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ نے ڈر اور خوف کے لہلہاتے سایوں کو مزید گہرا کیا۔ اس دوران جب لوگوں کو مستقبل تاریک دکھائی دینے لگا تو انہوں نے آنکھوں میں نئے خواب سجا کر ایک اور ہجرت کا سفر باندھا جو اب تک جاری ہے۔ اس دہری ہجرت کے محرکات پہلے سے مختلف تھے۔ ڈاکٹر جواز جعفری رقمطراز ہیں:

"ان مہاجروں کی ہجرت انفرادی ہے اور ہجرت کی کوئی ایک وجہ نہیں ہے۔ ہر شخص کی ایک اپنی کہانی ہے اپنا ہجری پس منظر ہے۔۔۔ کہیں ہجرت کے پس منظر میں مالی پریشانیاں اور کہیں سیاسی جبریت کارفرما نظر آتی ہے کسی کو غیر محفوظیت تو کسی کو خوشحال معاشروں میں آباد ہونے کا شوق دیارِ غیر تک لے آیا اور کوئی شوق سیاحت کو ہجرت کا رنگ دینے پر مصر ہے۔"(۱)

دیارِ غیر منتقل ہونے والے پاکستانی تارکین وطن برطانیہ، امریکہ، جرمنی، یونان، اٹلی اور کینڈا جیسے ترقی یافتہ ممالک میں رہائش پذیر ہیں۔ جہاں کی تہذیب و معاشرت مشرق کے برعکس ہے۔ بالخصوص برطانیہ اور امریکہ کی تہذیب و تمدن اور طرز معاشرت یکسر مختلف ہے۔ جہاں تارکین وطن کو گوناگوں مسائل کا سامنا کرنا پڑرہا ہے۔ ان مسائل میں سماجی، نفسیاتی اور خانگی وغیرہ کے مسائل شامل ہیں۔ تارکین وطن وہاں کے معاشرت سے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کوشش کے علاوہ انہیں کئی ایک پریشانیاں گھیرے رکھتی ہیں جن میں نئ نسل کا زبان وبیان، مذہب، تہذیب و ثقافت، سماجی و اخلاقی اقدار سے دوری نمایاں ہے۔ یہ ایک بے سمتی کا سفر معلوم ہوتا ہے۔ جو ایک عجیب قسم کی کشمکش میں مبتلا کرنے کا سبب بنتا ہے۔

ڈاکٹر شیر علی رقمطراز ہیں:

"برطانیہ کی غزل میں بے سمت سفر کا استعارہ بھی نمایاں ہوا ہے۔ پردیس کی زندگی میں اپنے وطن کی حرمت اور پاسداری کا احساس زیادہ شدید ہوجاتا ہے۔ اپنے "گھر" سے دوری دراصل گھر کی ویرانی پر منتج ہوتی ہے۔ اپنے گھر کو مسمار کر کے مغرب میں آسودگی کی جستجو سعیِ لاحاصل کے مترادف ہے۔ بعض شعراء کے ہاں اپنے وطن سے دوری اور لاتعلقی اور نئے دیس سے عدم مطابقت شدید ذہنی تناؤ کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔"(۲)

یہ بیزاری ان میں وطن کی یاد اور وطن پلٹنے کی شدید خواہش کو پیدا کرتی ہے۔ وہ وطن پلٹنا چاہتے ہیں لیکن وطن کے حالات آرے آجاتے ہیں۔ ملک کو اس وقت مختلف سیاسی، معاشی اور معاشرتی مسائل کے علاوہ اندرونی اور بیرونی خطرات کا سامنا ہے۔ تارکین وطن یہ سب منظرنامے کو دیکھ کر دیارِ غیر میں رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ذیل میں دیارِ غیر میں مقیم پاکستانی منتخب تارکین شعراء کی شاعری میں یہ دیکھنے کی سعی کی جائے گی کہ ان کی شاعری میں مراجعت کی خواہش کے عناصر کیا موجود ہیں؟ اگر موجود ہیں تو ان کی نوعیت کیا ہے؟

ا۔گھر سے دوری کا احساس:

گھر سے دوری کا احساس ایسی حالت ہے جس میں کوئی شخص اپنے گھر، ماحول یا وطن سے دور ہو اور اسے گھر، ماحول اور وطن کی یاد شدت سے محسوس ہو۔ یہ احساس عموما لوگوں میں تنہائی اور غمگینی کی شکل اختیار کرتا ہے۔ ایسی حالت میں فرد یہ خواہش ظاہر کرتا ہے کہ وہ اپنے گھر کے قریب ہو، اپنے پیاروں کے ساتھ لمحے بیتائے اور ایک مانوس ماحول میں سانس لے۔ بات جب یورپین ممالک کی ہو رہی ہو تو سات سمندر پار یہ احساس مزید گہرا ہو کر تنہائی اور افسردگی کا روپ دھار لیتا ہے۔ کچھ لوگ اس احساس میں وطن سے متعلق خوشگوار یادوں کے سہارے اور کچھ لوگ ناخوشگوار یادوں کے سہارے جیتے ہیں۔ اس غریب الوطنی میں زیادہ تر لوگ ملک پلٹنے کی خواہش ظاہر کرتے ہیں لیکن کچھ لوگ ملکی حالات پر کراہتے ہیں اور وہی رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

ڈاکٹر شیر علی رقمطراز ہیں:

> "برطانیہ کی سماجی اور تہذیبی زندگی سے عدم مطابقت اور مجبوراً اسی فضا میں زندگی کرنے کا رویہ ایسے نفسیاتی، سماجی اور خانگی مسائل پیدا کرتا ہے جن کی پوری تفہیم اور احساس بہت مشکل ہے۔ برطانیہ میں مقیم باشندے ان پریشانیوں اور مشکلات کی بنا پر بارہا واپس جانے کو ترجیح دیتے ہیں لیکن ان کے آبائی وطنوں میں سیاسی اور معاشی زبوں حالی ان کو اسی تہذیبی دلدل میں رہنے پر مجبور رکھتی ہے۔"(۳)

دیارِ غیر میں تارکین وطن کو مذکورہ بالا مسائل سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ جس سے تارکین وطن شعراء کی شاعری میں غریب الوطنی کی زندگی کرب وجور کا استعارہ بن کر ابھرتی ہے۔ ایسا کرب وجور جو ناسور کی شکل اختیار کر جاتا ہے جو رفتہ رفتہ انہیں اندر سے کھوکھلا کر دیتا ہے۔ وہ اس کرب وجور کو داخلی سطح پر شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں۔ جس کا اظہار اپنی تحریروں یا اشعار کی صورت میں کرتے ہیں۔ ان شعراء میں ایک نام احمد مشتاق کا بھی ہے۔

عدنان بشیر رقمطراز ہیں:

> "ناصر کاظمی ہوں یا انتظار حسین ہوں یا احمد مشتاق ہوں ان کی تحریریں ان زمانوں اور ان دیاروں کی طرف مراجعت کا خواب ہیں جن میں ان کی شعری تربیت کے لیے اول اول کسی آنکھ میں رنگِ حیا جھلکا تھا، کسی دستِ ناک پر حنا کی آتش دہکی تھی اور کوئی زلفِ پریشاں مہکی تھی۔"(۴)

احمد مشتاق مغربی طرز زندگی کا عمیق مشاہدہ رکھتے ہیں جس کا اظہار ان کی شاعری میں ملتا ہے۔ان کی شاعری میں مشرق اور مغرب کے طرز زندگی میں واضح فرق دکھائی دیتا ہے۔ مغرب میں بلند و بالا عمارتوں، فلیٹ اور ریسٹ ہاؤس کا تصور ہے۔ جن میں گھول سیڑھیاں اور لفٹ زندگی کو سہل بنانے کے لیے استعمال کی جاتی ہیں جو آسانی کے باوجود آدمی کے لیے گھٹن اور تکلیف کا سبب بنتی ہیں۔ آرائشِ مکاں کا ساماں بھی مصنوعی ہوتا ہے۔ جو آنکھ کے لیے تو تازگی کا باعث بنتا ہے لیکن روح کو ابدی سکوں نہیں پہنچا پاتا۔بنیادی طور پر مکانوں کی آرائشوں زیبائش سے مغربی طرززندگی پر طنز کیا گیا ہے۔اس کے برعکس مشرق میں گھر کا تصور محبت،خوشحالی اور سکون کا استعارہ ہے۔یہ گھر چھوٹے چھوٹے ہونے کے باوجود ایک باقاعدہ خانگی نظام رکھتے ہیں۔ جس کی سرپرستگی گھر کے بڑوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ جو خوشیوں اور دکھ سکھ میں تمام کنبے کو جوڑ کر رکھتے ہیں۔ مغرب کی نئ طرز معاشرت سے تنگ آکر احمد مشتاق کی شاعری میں گھر سے دوری کا احساس پیدا ہوتا ہے۔

چھوٹا سا اک گھر تھا درختوں کی اوٹ میں
بامِ بلند و زینہ پیچاں نہ تھا کوئی (۵)

اس احساس میں ملک پلٹنے کی خواہش ان کے اندر سر اٹھاتی ہے۔ لیکن یہ خواہش جلد ہی ایک ایسی ناکام تمنا میں تبدیل ہو جاتی ہے۔جو کبھی پوری نہیں ہوتی۔جو ایک شدید قسم کی مایوسی کا سبب بنتی ہے۔وہ جب کبھی پلٹنے کا ارداہ کرتے ہیں تو مغربی طرز معاشرت ان کے پاؤں کی زنجیر ہو جاتی ہے۔ایسی زنجیر جس میں پاؤں اور گردن جکڑے ہوئے ہوں۔جس میں قیدی کو قدم اٹھانا خود کو اذیت دینے کے مترادف معلوم ہوتا ہے۔اگر یہ اذیت برداشت کر بھی لیجئے تو رستے بند گلی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

نبی احمد رقمطراز ہیں:

> ”احمد مشتاق دیارِ غیر سے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں مگر لاکھ کوشش کے باوجود بھی نہیں نکلا جاتا حالات نے انہیں حالات نے ایسے جکڑ رکھا ہے کہ وہ چاہتے ہوئے بھی وطن واپس نہیں آ سکتے۔“(۶)

گھر جاتا ہے دل درد کی ہر بند گلی میں
چاہو کہ نکل جائیں تو رستہ نہیں ہوتا (۷)

ساقی فاروقی کی شاعری اسلوب کے ساتھ نئے طرزِ احساس کی شاعری ہے۔انہوں نے مشرقی اور مغربی تہذیب و تمدن اور زندگی کرنے کے رویے کا بغور مشاہدہ کر رکھا ہے۔ جس کی جھلک ان کی شاعری میں ملتی ہے۔ان

کی ہجرت بھی فکر معاش کے سلسلے میں ہوئی تھی۔ یہ ہجرت مستقل قیام کے لیے نہیں بلکہ معاشی طور پر مستحکم ہونے کے لیے عارضی بنیادوں پر کی گئی تھی۔ جس میں پلٹنے کا ایک در رکھا گیا تھا۔ لیکن گردشِ حالات نے اس دروازے کو رفتہ رفتہ مستقل مقفل کر دیا۔ وہ مغربی زندگی سے بیزار نظر آتے ہیں۔ اس زندگی نے انہیں مادی طور پر تو مستحکم کر دیا ہے لیکن روحانی و اخلاقی طور پر مایوس کیا ہے۔ اس مایوسی کے عالم میں ان کے دل میں گھر کی تمنا جاگتی ہے۔ اس گھر کی طرف جس کے ساتھ ان کی ذہنی و جذباتی وابستگی ہے۔ مگر ملکی سیاسی و سماجی اور معاشی حالات نے گھر کے نقشے کو کھنڈر میں بدل دیا ہے۔ اب مکیں کیا سوچ کر گھر کو پلٹیں۔ ان کی خواہش کا گلا گھونٹ دیا گیا ہے۔

اب گھر بھی نہیں اور گھر کی تمنا بھی نہیں ہے
مدت ہوئی سوچا تھا کہ گھر جائیں گے اک دن (۸)

منصور آفاق کی شاعری میں بھی گھر کو ترک کرنے کے پیچھے تلاشِ معاش کار فرما لگتی ہے۔ جس نے ان سے ماں باپ، بہن بھائی اور دوست احباب چھین لیے ہیں۔ اجنبی ملک میں انہیں اپنا وطن اور اپنے لوگ شدت کے ساتھ یاد آتے ہیں۔ وہ تارکین وطن کے لیے کونج کا استعارہ استعمال کرتے ہیں۔ جو ایک مہاجر پرندہ ہے۔ جس کا کوئی ٹھوٹھکانہ نہیں ہوتا۔ جسے مہاجرت کی زندگی میں گھر کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ بالخصوص اس وقت زیادہ ہوتا ہے جب سفر کی کرب ناکی میں کونج ڈار سے بچھڑ جاتا ہے۔ کونج اگر ایک بار ڈار سے بچھڑ جائے تو اس کی موت یقینی ہوتی ہے۔ تارکین وطن کو بھی مہاجرت کی زندگی میں اپنے پیاروں سے بچھڑنا ڈار سے بچھڑنے کے مترادف معلوم ہوتا ہے۔ اس مسافت میں انہیں گھر کی اہمیت اور گھر کو آباد کرنے کا خیال آتا ہے۔

کونج کی سسکاریاں سن کر کھلا رخصت کی شام
گھر بڑی شے ہے اسے آباد رکھنا چاہیے (۹)

علی ارمان کی شاعری میں برطانوی روزمرہ زندگی سے تنگی، بوریت اور اکتاہٹ کا عنصر ملتا ہے۔ جو فرصت کے لمحات کا متلاشی دکھائی دیتا ہے۔ ایسے میں وطن سے دوری کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ جہاں اس کا بچپن اور لڑکپن گزرا ہے۔ یہ احساس اس میں ناسٹلجیا کو پیدا کرتا ہے۔ جس میں وہ اپنے گھر، اپنے پیاروں اور اپنے بچپن کے دنوں کو یاد کرتا ہے جہاں اسکول کی چھٹیاں عیش و عشرت کے دنوں میں شمار ہوتی ہیں۔ بچے ہوا کے دوش پر سوار ہو کر سارا سارا دن نہ دھوپ دیکھیں، نہ بارش، کھیل کود میں مگن رہتے ہیں۔ شاعر بھی انہیں دنوں کو یاد کرتا ہے۔

گرمیوں میں جب گھر والے سو جاتے تھے
دھوپ کی انگلی تھام کے ہم چل پڑتے تھے

ساون ہمیں بلانے جب گھر آیا تھا
پاگل بادل بن کر ہم چل پڑتے تھے (۱۰)

۲۔ رائیگانی اور لاحاصلی کا دکھ:

رنج رائیگانی اور لاحاصلی کا دکھ انسان کے ساتھ ازل سے ہے اور شاید ابد تک رہے گا۔ یہ احساس عموماً باشعور اور زیرک لوگوں کے ذہن کی پیداوار ہے۔ جو تادم مرگ رہتا ہے۔ احساس زیاں موجود عہد میں مشینی اور میکانکی نظام کی پیداور ہے۔ پہلے وقتوں میں کھوج اور تلاش کی جستجو اس خلا کو پر کرتی تھی۔ یہ کھوج اور لگن انسان کو اپنے ہونے، بلند مقاصد اور ارفع ہونے کا احساس دلاتی تھی۔ جو ایک مثبت طاقت کے طور پر سامنے آتی تھی۔ جو ہر طرح کے حالات وواقعات سے نبرد آزما ہونے کے لیے ذہن سازی میں کارآمد ثابت ہوتی تھی۔

تارکین وطن کی دیارِ غیر میں ہجرت بالخصوص مغربی ممالک میں مادی آسائشوں کی غرض سے ہے یہ ایک ایسا محرک ہے جو دیگر محرکات پر غالب آتا ہے۔ مغربی معاشرے مادی آسائشوں اوراشیاء کی فراوانی سے لیس ہیں۔ جہاں مشین کی حکومت ہے۔ انسانی جذبات و احساسات دولت سے منسلک ہیں۔ یہاں کی تہذیب وثقافت روحانیت سے عاری ہے۔ ایسی معاشرت میں تارکین وطن تگ ودو کر کے شہریت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور کسی نہ کسی طرح ماحول سے بھی مطابقت پیدا کر لیتے ہیں۔ لیکن پھر بھی کئی طرح کے مصائب اور پریشانیاں انہیں اپنے گھیرے میں رکھتی ہیں۔ جو ان کی شناخت کو مسخ کرتی ہیں۔ اورانہیں اپنے ہونے، نہ ہونے کے بارے میں سوچنے پر مجبور کرتی ہیں۔ جس سے ایک قنوطیت کی فضا پیدا ہوتی ہے جو ازل سے ابد تک کی طویل مسافت کو بھی رائیگاں اور لاحاصل سمجھنے لگتی ہے۔

احمد مشتاق کی شاعری میں رائیگانی اور لاحاصلی کا دکھ زندگی کے گہرے مشاہدے سے جنم لیتا ہے۔ ان کی تمام زندگی رختِ سفر باندھتے ہوئے گزری ہے۔ جس کو اجنبی رہزانوں نے خوابوں کی نگری میں قدم رکھنے سے قبل ہی لوٹ لیا۔ یہ ساماں مادی ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے جذبات واحساسات پر مشتمل تھا۔ تقسیم ہند کے بعد نئے پاکستانی معاشرے نے مایوسی کی فضا میں اضافہ کیا۔ جبکہ مغربی میکانکی معاشرے نے مادی آسائشوں کو تو کسی حد تک پورا کیا لیکن جذبات واحساسات کا قتل عام کیا۔ اس مایوسی اور جذبات واحساسات کے قتل نے احمد مشتاق کے لاشعور میں رائیگانی اور لاحاصلی کے گہرے احساس کو پیدا کیا۔ جس کا اظہار ان کی شاعری میں جابجا دکھائی دیتا ہے۔ مشتاق کے نزدیک عموماً مسافر کا سفر میں لٹنے کے بعد کچھ نہ کچھ ازالہ کیا جاتا ہے۔ لیکن رائیگاں سفر کا ازالہ کیا ہو سکتا

ہے جب کہ معلوم ساماں کا ازالہ ممکن نہیں۔اب تو یہ مقام آن پہنچا ہے کہ انہیں اس رائیگاں سفر کو اختیار کرنے کا حوالہ بھی نہیں ملتا۔

ازالہ سفر رائیگاں تو کیا ہوتا
حوالہ سفر رائیگاں بھی کوئی نہیں(۱۱)

مغرب کی زندگی ایک قسم کا طلسم ہے۔ایسا طلسم جس کے سحر سے کوئی نہیں نکل سکتا۔ساقی فاروقی بھی اسی طلسم کی نذر ہوئے ہیں۔بظاہر لگتا ہے کہ وہ مغربی چکاچوند معاشرے سے ایسے متاثر ہوئے ہیں کہ وہی کہ ہو کر رہ گئے ہیں۔لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔وہ مغربی زندگی کی دلکشیوں اور رعنائیوں میں کھوئے تو ضرور ہیں لیکن اس کے سحر میں گرفتار نہیں ہوئے۔وہ جسمانی طور پر تو برطانیہ میں مقیم ہیں اور اس معاشرت کو قبول کرتے ہیں لیکن ذہنی طور پر برطانیہ سے بدگماں ہیں۔وہ جانتے ہیں کہ برطانوی معاشرت روحانیت اور اخلاقی اقدار سے حالی ہے۔یہی وجہ ہے کہ وہ نہ صرف اس تہذیب سے بدگماں دکھائی دیتے ہیں۔بلکہ دوہری ہجرت کو بھی رائیگانی کا سفر گردانتے ہیں۔

دنیا ہزار سحر تھی، دنیا ہزار رنگ
ہم بدنصیب لوگ ذرا بدگماں چلے(۱۲)

دوہری ہجرت کا خواب ساقی فاروقی نے آنکھوں میں اس لیے سجایا تھا تاکہ پہلی ہجرت سے روح پر لگنے والے زخم کا ازالہ ہو سکے۔وہ نئے سرے سے زندگی کی شروعات کرنا چاہتے تھے۔لیکن بدقسمتی یہ ہوئی کہ ان کا یہ سفر بھی رائیگاں گیا۔انہیں برطانیہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں بھی نہ صرف اپنا بلکہ اپنی آئندہ نسلوں کا مستقبل تاریک دکھائی دیتا ہے۔

یہ روح کی بستی پھر مسمار نظر آئی
تعمیر کی ہر سازش بے کار نظر آئی(۱۳)

منصور آفاق کی شاعری میں محبت جیسا پاکیزہ جذبہ کسی کے لیے رکھنا اور اسی کو سوچتے رہنا بھی لاحاصلی کا سفر معلوم ہوتا ہے۔لیکن وہ اس لاحاصلی کے سفر کو اختیار کیے ہوئے ہیں۔ظاہر ہے ان کے ہاں یہ رائیگانی کا ایک احساس ہے۔جو مغربی معاشرے کی بے حسی نے ان کے اندر پیدا کر دیا ہے۔یہ احساس وجود کے حوالے سے تشکیک کو پیدا کرتا ہے۔کہ آیا کوزہ گر نے ان کے خدوخال بنائے بھی ہیں یا نہیں؟یا ابھی تک ان کے نقوش کوزہ گر کے دماغ میں ثبت ہیں؟کیوں کہ شاعر کو یقین نہیں آرہا کہ اس کو تشکیل دیا جا چکا ہے۔شعر میں "ابھی تک" کے استعمال سے معلوم پڑتا ہے کہ مہاجرت کا عذاب جھیلنے کے باوجود اسے اپنی زندگی رائیگاں جاتی ہوئی دکھائی دے رہی ہے۔

مجھ کولا حاصلی میں رہنا ہے
میں تجھے سوچتا ہوں ویسے ہی (۱۴)

دماغِ کوزہ گر میں ہیں ابھی تک خال وخد میرے
ابھی تک ایسا لگتا مجھے تشکیل ہونا ہے (۱۵)

۳۔ قوم پرستی:

قوم پرستی میں فرد اپنے خاندان، نسل، قبیلے اور ملک کو دیگر سے افضل گردانتا ہے۔ ہر صورت میں اپنے ملک یا قوم کی حمایت وطرفداری کرتا ہے۔ قوم پرستی کی ابتدا آغاز سے رہی ہے۔ لیکن آغاز میں یہ نسل پرستی تک محدود تھی۔ ارسطو نے "السیاست" میں اس پر حاصل خواہ بحث کی ہے۔ جس میں وہ دیگر وحشی قوموں کو غلام بنائے رکھنے کے حق میں ہے۔ غلام بنانے کے لیے ہر طرح کی حکمت عملی اپنائی جاسکتی ہے۔ وہ اپنی اخلاقی اقدار کو دیگر سے ارفع خیال کرتا ہے۔ نسل پرستی کو مذہب نے ایک عرصے تک روکی رکھا۔ کیوں کہ مذہب اس سے بالاتر ایک انسانیت کا نظام رکھتا ہے۔ رومن نے بھی نسلی تعصب کو مشترکہ اقتدار کے ماتحت کیا۔ جس سے چھوٹی قوموں میں نسل پرستی کی شدت کو کافی حد تک کم کیا گیا۔ ایک عرصے تک پوپ اور چرچ کے روحانی اور سیاسی اقتدار کے کٹھ جوڑ نے مسیحیت کو روکی رکھا۔ یہ کٹھ جوڑ ظلم وستم اور عقلیت کے لیے تو متحد تھا لیکن ذاتی فوائد حاصل کرنے کے لیے حریف کے طور پر سامنے آیا۔ جس نے سولہویں صدی میں تحریک اصلاح کو بنیادیں فراہم کیں۔ یہ تحریک اہل مغرب کو چرچ اور شہنشاہت سے چھٹکارا حاصل کروانے میں مدگار ثابت ہوئی۔ لیکن سیاسی اور روحانی حوالے سے خاطر خواہ کوئی نظام فراہم نہیں کرسکی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قوموں نے خودمختاری کا اعلان کرنا شروع کردیا۔ ہر قوم کے ذاتی مفاد دوسری قوم سے مختلف ہونے لگے۔ ہر قوم کا نسلی، سیاسی، معاشی اور تہذیب و ثقافتی فرق واضح طور پر سامنے آنے لگا۔ جس نے دوسروں کے حقوق کو پامال کیا اور وسائل پر قابض ہونے کے لیے ظلم وستم کے پہاڑ توڑے۔ قومیت کا یہ نیا احساس ترقی کرتے کرتے قوم پرستی میں تبدیل ہوا۔

تارکین وطن کو برطانیہ کی نئی معاشرت میں تیسرے درجے کا شہری سمجھا جاتا ہے۔ جس سے ان میں ادنی ہونے کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ برٹش نے چونکہ پوری دنیا میں نوآبادیاتی نظام قائم کیے رکھا جس کی وجہ سے ان کے ہاں حاکمیت کا تصور اب بھی موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تارکین وطن کے ساتھ ناروا سلوک رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کو شہریت حاصل کرنے کے باوجود یا پیدائشی شہری ہونے کے باوجود بنیادی حقوق سے محروم رکھا جاتا ہے۔ جو حقوق ایک مقامی برطانوی شہری کو دیے جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ان میں شدید احساس کمتری کے

جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں شناخت کا مسئلہ سر اٹھاتا ہے۔ اس تشخص کی تلاش میں تارکینِ وطن میں قوم اور وطن کے لیے محبت کے جذبات ابھرتے ہیں۔ جس میں کسی قسم کی تفریق نہیں۔ انہی وجوہات کی بنیاد پر پاکستانی تارکینِ وطن اپنی تاریخ، تہذیب، ثقافت اور سیاست کے لیے محبت کے جذبات رکھتے ہیں۔ یہ جذبات ان میں قوم پرستی کو ہوا دیتے ہیں۔ وہ مغربی تہذیب اور بہترین ممالک اور اعلیٰ نسل میں رہنے کے باوجود خود کو پاکستانی باشندہ کہلوانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔

دنیا و جہان کی آسائشیں حاصل کرنے کے باوجود بیگانگی اور اجنبیت کا احساس تارکینِ وطن کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے۔ اس اجنبیت کا احساس وہاں کی معاشرت میں موجود گوناگوں مسائل کا سامنا، حکومت کی پالیسیوں میں تارکین وطن کو تیسرے درجے کا شہری سمجھنا اور مقامی لوگوں کا تارکین وطن کے ساتھ ناروا سلوک کی پیداوار ہے۔ احمد مشتاق کی شاعری میں اس ماحول میں اجنبیت اور بیگانگی کا اظہار احساس کمتری اور تشخص کی تلاش کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہ احساس کمتری اور تشخص شاعر سے سوالیہ انداز میں خود کلامی کرتا ہے۔ جس میں وہ پوچھتا ہے کہ جہاں بھر کی آسائشیں حاصل کرنے کے باوجود تو دنیا سے خوش کیوں نہیں؟ دنیا سے مراد وہاں کا بہترین ماحول ہے۔ مزید وہ پوچھتا ہے کہ بہترین ماحول کے علاوہ آسمان سے تو اور کیا چاہتا ہے جس سے تیرے قلب و روح کو سکون حاصل ہو سکے؟ یہ سوالات شاعر کو بے چین کیے رکھتے ہیں۔ اس بے چینی کے عالم میں اس کو اپنا وطن اور قوم سے ملنے والی محبت یاد آتی ہے جو اس میں قومیت کے جذبات کو پیدا کرتی ہے۔ اس وطن میں آسائشِ دنیا نہ ہونے کے باوجود سکون اور امن تھا۔ اتفاق اور بھائی چارہ تھا۔ رنگ اور نسل کی تفرق نہیں تھی۔ یہاں تک کہ اقلیتوں کو بھی بیگانگیت کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ ہر طرف محبت کا الم بلند تھا۔ اس ضمن میں وہ اپنے خانگی نظام اور تہذیب اور ثقافت کو بھی یاد کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ جو اس کے اندر پاکستانی ہونے پر فخر کرتی ہے۔

مطمئن کیوں نہیں جہان سے ہم
چاہتے کیا ہیں آسمان سے ہم
تھی کبھی ایک بود و باش اپنی
تھے کبھی ایک خاندان سے ہم (۱۶)

۴۔ پاکستانیت:

پاکستان سے جذباتی اور ذہنی ہم آہنگی پاکستانیت کہلاتی ہے۔ پاکستانی دنیا میں چاہے جس بھی ملک میں مقیم ہوں وہ پاکستانیت کے جذبے سرشار ہوتے ہیں۔ پاکستان کی اکثریت مسلم تہذیب سے تعلق رکھتی ہے۔ جن کا

مذہب اسلام ہے۔ جبکہ اقلیتیں ارضی حوالے سے ہندوستان کی قدیم قومیں ہیں۔ جو ایک مدت سے ہم آہنگی اور یگانیت کے ساتھ رہائش پذیر ہیں۔ پاکستان کا جغرافیہ بہت دلکش اور وسائل سے بھرپور ہے۔ علاقائی زبان و ادب اور مختلف ثقافتیں اس کو چار چاند لگائے ہوئے ہیں۔ اردو رابطے کی زبان ہے جو ہر علاقے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ یہاں کے لوگوں میں ایک دوسرے کے ساتھ رشتے کا لین دین بھی ہوتا ہے۔ پاکستان زراعی ملک ہے اس لیے زراعت کا قومی سرمائے میں ایک بہت بڑا حصہ ہے۔ مختلف میدانوں میں نوجوان اپنالوہا منوا رہے ہیں۔ پاکستانی خیرات اور سخاوت میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ عموماً ملک اور قوم کو مختلف مسائل کا سامنا بھی رہتا ہے۔ جس سے سبھی یکجا ہو کر نبرد آزما ہوتے ہیں۔ پاکستانی تارکین وطن ملک و قوم سے دور ہونے کے باوجود ملک کی مٹی سے جڑے ہوئے ہیں۔ وہ ایک بڑا سرمایہ کما کر ملک میں بھیجتے ہیں۔ جس سے ملک کا نظم نسق چلتا ہے۔ عموماً ملک کو جب مسائل سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے تو اس میں ایک بہت بڑا حصہ پاکستانی تارکین وطن کا ہوتا ہے۔

تارکین وطن شعراء دیارِ غیر میں پاکستان سے جذباتی اور ذہنی ہم آہنگی قائم رکھے ہوئے ہیں۔ احمد مشتاق انہیں شعراء میں سے ایک ہیں۔ وہ بہترین طرزِ معاشرت میں منتقلی کے باوجود ذہنی سطح پر اپنی مٹی اور تہذیب وثقافت کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ لیکن پاکستان کے ناساز گار حالات سے مایوس اور ناراض دکھائی دیتے ہیں۔ دیارِ غیر میں پاکستان کے حالات پر کراہنے کے سوا ان کے پاس کوئی اور چارہ نہیں بچتا۔

فارینہ بشیر رقمطراز ہیں:

> "اصل میں وہ پاکستان سے بہت لگاؤ رکھتے تھے اور پاکستان کی حالت پر کڑھتے بھی ہیں اور اسے بدلنے کا خواب بھی دیکھتے ہیں۔"(۱۷)

ان کی خواہش ہے کہ پاکستان کے لوگوں کو بھی وہ بنیادی ضروریات میسر آئیں۔ جو ایک ترقی یافتہ ملک کے شہریوں کو میسر آتی ہیں۔ بدقسمتی سے پاکستان میں کوشش کے باوجود مسائل اپنی جگہ جوں کہ توں موجود ہیں۔ ملک میں دودھ اور صاف پانی سے لے کر امن اور انصاف تک ناپید ہے۔

دودھ ملے چاندی جیسا اور پانی صاف ملے
امن ملے تیرے بچوں کو اور انصاف ملے (۱۸)

ساقی فاروقی کی قسمت کا ستارہ برطانیہ میں جا کر چمکا۔ برطانیہ میں وہ معاشی طور آسودہ ہوئے۔ اس آسودگی میں وہ اپنے وطن کو نہیں بھولے جس سے ان کا جذباتی و ذہنی ارتباط ہے۔ مٹی سے یہ محبت ان کی روح میں پیوست

ہے۔حالانکہ ان کو پاکستانی معاشرے میں شدید معاشی مسائل کا سامنا رہا ہے۔ساٹھ اور ستر کی دہائی میں کراچی شہر دیے کی مانند تھا جس کی روشنی سے ہر کوئی مستفید ہوتا تھا۔اس زمانے میں بے روزگاری کا سوال بھی پیدا نہیں ہوتا تھا۔بد قسمتیِ زمانہ،اس میخانے میں رہتے ہوئے بھی ساقی فاروقی کو فاقہ کشی کا سامنا رہا ہے۔اس حوالے سے وہ برطانیہ کا شکر بجالاتے ہیں لیکن اپنی شناخت کا معتبر حوالہ وہ پاکستان کو قرار دیتے ہیں۔

مجھے جس دیے سے اندھیرا ملا
وہی روشنی کا وطن بھی تو ہے (۱۹)

موجودہ ملکی منظر نامے پر نگاہ دوڑائی جائے تو تارکینِ وطن کے پاس ملکی حالات پر کراہنے کے سوا کچھ نہیں بچتا۔ملک کو سیاسی، سماجی اور معاشی مسائل کا سامنا ہے۔بالخصوص ملک میں سیاسی عدم استحکام ہے۔ہر کوئی ملک کا خیر خواہ بنے کا دعوے دار ہے لیکن یہ سب دعوؤں اور جھوٹے وعدوں تک ہی محدود ہے۔بد قسمتی سے ملک بنے سے لے کر اب تک مخلص قائدین کا فقدان رہا ہے۔جو ملک اور قوم کے بارے میں سوچے۔جو بھی سیاست میں آتا ہے وہ اپنے اثاثوں میں اضافہ کرتا ہے اور ملک کو نہ قابل تلافی نقصان پہنچاتا ہے۔ان قائدین میں زیادہ تر سرمایہ دار، جاگیر دار اور وڈیرے شامل ہیں۔افلاطون نے کہا تھا الیڈ کلاس سیاست میں ٹیکسوں میں چھوٹ اور عدالتی تحفظ حاصل کرنے کے لیے آتی ہے۔بد قسمتی سے ملکِ پاکستان کو ملنے والے قائدین یہی کچھ حاصل کر رہے ہیں۔منصور آفاق تارکین وطن کی توانا آواز بن کر درد بھرے لہجے میں اللہ سے ملک و قوم کے لیے کسی مخلص قائد کو مانگتے ہیں تاکہ ملکی حالات سنور سکیں۔

میرے پاکستان کو بھی
کوئی چارہ گر دے مولا (۲۰)

۵۔حب الوطنی:

انسان کی پیدائش جس مٹی میں ہوئی ہو اس سے محبت ایک فطری عمل ہے۔وہ وطن میں سانس لے رہا ہو یا وطن سے دور کہیں دیارِ غیر میں مقیم ہو، ثقافتی اور فکری لحاظ سے ملک و مٹی کے ساتھ جڑا ہوتا ہے۔وہ ملک و قوم کے لیے کسی بھی قسم کی قربانی دینے سے دریغ نہیں کرتا۔حب الوطنی ایک ایسا جذبہ ہے جو قوم کو متحد رکھتا ہے۔یہ لوگوں میں ایثار، قربانی اور اتحاد کو پیدا کرتا ہے۔یہ جذبہ اس وقت آتشی ہوتا ہے جب مدمقابل کوئی دوسری قوم آ کر کھڑی ہو۔تاریخی انسانی میں دو مختلف قومیں ہمیشہ ایک دوسرے کے مدمقابل آتی رہی ہیں جو کبھی تحفظ تو کبھی حملہ آور کی صورت میں۔

حب الوطنی کے بارے میں ڈاکٹر خوشحال زیدی رقمطراز ہیں :

> ”حب الوطنی کا مطلب اپنے ملک کی فلاح و بہبود کا تحفظ کرنا۔ اپنے ملک کی چیزوں سے محبت کرنا، انہیں بڑھاوا دینا اور اپنے ملک کی آزادی اور حقوق کی حفاظت کرنا ہے۔ ساتھ ہی غیر ملکی حملوں اور اندرونِ ملک، ملک دشمن عناصر سے اپنے ملک کو بچانا ہے۔“[۲۱]

پہلی جنگ عظیم کے بعد حب الوطنی کے جذبے کو تقویت بخشی گئی۔ اس میں اٹلی، جرمنی، فرانس اور دیگر یورپین شامل تھے۔ برصغیر میں حب الوطنی کا جذبہ اٹھارہویں صدی میں شروع ہوا۔ لیکن باقاعدہ تقسیم ہند کے بعد اس جذبے کو بھڑکاوا ملا۔ پاک بھارت اور پاکستان کئی بار ایک دوسرے کے مدمقابل آچکے ہیں۔ جس میں ملک و قوم کے سپوتوں نے پاک مٹی کی حفاظت میں جانیں قربان کر کے ملک و قوم کے دفاع کو ناقابلِ تسخیر بنایا ہے۔ موجودہ زمانے میں مذکورہ جذبہ اس لیے بھی تقویت حاصل کر رہا ہے کیوں کہ ملک کو معاشی، معاشرتی اور سیاسی عدم استحکام کا سامنا ہے۔ جس کی وجہ سے لوگ ملک کو مجبوراً چھوڑنے پر مجبور ہیں۔ وہ اپنے وطن کو چھوڑ کر یورپین ممالک کو اپنا مسکن بنا رہے ہیں۔ مغربی ممالک جغرافیائی اور تہذیبی لحاظ سے مشرق سے بہت جدا ہے۔ جس کی وجہ سے تارکین وطن کو اپنا ملک شدت سے یاد آتا ہے۔ ملک کے حالات پر پاکستانی تارکین وطن کراہتے ہیں۔ اب بھی ملک و قوم کو جب بھی کسی قسم کا خطرہ لاحق ہوتا ہے تو سب سے زیادہ تارکین وطن چیخ اٹھتے ہیں اور وطن کی محبت میں اپنا سب کچھ لٹانے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔

احمد مشتاق نے دوہری ہجرت کا کرب سہا ہے۔ پاکستان سے ان کی دلی وابستگی ہے۔ لاہور شہر کی رونقوں میں ان کی جوانی گزری ہے۔ جہاں ان کو بہترین دوست ملے ہیں جن میں ناصر کاظمی اور انتظار حسین کا نام سرفہرست ہے۔ وہ اب بھی پاکستان تشریف لاتے ہیں اور ان دنوں کو یاد کرتے ہیں۔ ۲۰۲۴ء میں بھی انہوں نے پاکستان کا ایک مختصر دورہ کیا اور لاہور شہر کو رونقیں بخشی۔ پاکستان میں قیام کے دوران سرد اور گرم موسموں سے ان کی آشنائی رہی ہے۔ تقسیم ہند، پینسٹھ کی جنگ، فوجی مارشل لاؤں اور سقوط ڈھاکہ نے ان کی شخصیت پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ ملکی حالات اور معاشی صورت حال کے پیشِ نظر ملک سے خفا ہو کر دیارِ غیر میں جا بیٹھے ہیں۔ وہ اب بھی ملک سے بے لوث محبت رکھتے ہیں لیکن ملکی حالات پر نوحہ کنعاں دکھائی دیتے ہیں۔ انہوں نے نہ صرف اس سے خارجی اثر کو قبول کیا ہے بلکہ داخلی سطح پر بھی اثر قبول کیا ہے۔ ان کے اندر ایک ایسی آگ لگی ہوئی ہے جس کے الاؤ میں انہیں اپنا شہر جلتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ جس میں ان کے اپنے لوگ جل رہے ہیں۔

دلوں کی اور دھواں سا دکھائی دیتا ہے
یہ شہر تو مجھے جلتا دکھائی دیتا ہے[۲۲]

ساقی فاروقی بھی احمد مشتاق کی طرح ملکی حالات پر کراہتے ہوئے قوم کو بیدار کرنے کا خواب دیکھتے ہیں۔لیکن بد قسمتی یہ ہے کہ قوم خواب غفلت میں سو رہی ہے۔اسے اپنے حالات بدلنے سے کسی قسم کا سروکار نہیں۔ملک میں سیاسی ،سماجی اور معاشی حوالے سے عدم استحکام ہے۔قوم پر ظلم و جبر کے پہاڑ توڑے جارہے ہیں۔غریب غیریب تر اور امیر امیر تر ہوتا جارہا ہے۔ان حالات میں چند لوگ جو اپنے آپ کو باشعور سمجھتے ہیں اور ملک میں تبدیلی کے خواہاں ہیں وہ بھی نالائق سیاست دانوں کے ہتھے چڑھے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔سیاسی جماعتیں جمہوریت سے زیادہ بادشاہت پر یقین رکھتی ہیں۔سیاست دانوں اور کارکنوں کی سیاسی تربیت نہ ہونے کے برابر ہے۔ہر کوئی جذباتیت کا شکار دکھائی دیتا ہے۔گالم گلوچ کا کلچر عام ہے۔قوم مختلف تفرقات میں بٹی ہوئی ہے جس سے ملک میں انقلاب نہیں لایا جاسکتا۔ساقی فاروقی قوم سے مایوس دکھائی دیتے ہیں۔ان کے نزدیک ملک کو مستحکم کرنے کے لیے ایک باقاعدہ منظم قوم اور نظام کی ضرورت ہے۔

میں نے الجھ کے دیکھ لیا اپنی گونج سے
اب کیا صدا لگاؤں کوئی جاگتا نہیں[۲۳]

منصور آفاق کی شاعری میں وطن اور اس سے جڑی اشیاء سے محبت کا اظہار بے ساختہ انداز میں ملتا ہے۔جس میں وہ اپنے چمن کے برگ و سمن اور زبان و سخن کو جہاں بھر سے ممتاز سمجھتے ہیں۔پاکستان کی سرزمین سرسبز وادیوں،بلند و بالا چوٹیوں، کھلے میدانوں اور تپتے ہوئے ریگستانوں پر مشتمل ہے۔اس کے علاوہ چاروں موسم بہار، خزاں، سرما اور گرما قدرت کا حسین تحفہ ہیں۔مزید یہاں پر مختلف رنگ و نسل اور قبائل سے تعلق رکھنے والے لوگ رہتے ہیں جو مختلف زبانیں بولتے ہیں۔جو ایک گلدستے کی طرح معلوم ہوتی ہیں۔اردو ملک کی قومی زبان ہے جو علاقائی اور بین الاقوامی زبانوں کو اپنے اندر سمائے ہوئے ہے۔اس کے برعکس برطانیہ اور دیگر مغربی ممالک کی سرزمینیں سالہا سال برفباری اور سردی کی لپیٹ میں رہتی ہیں۔یہاں چاروں موسموں سے بھی لطف اندوز نہیں ہوا جاسکتا۔ منصور آفاق کی شاعری میں ان پاکستانی تارکین وطن کے جذبات کی ترجمانی ملتی ہے جو مغربی ممالک میں اپنے ملک کی سرزمین، موسموں کے تغیر اور زبان کو شدت کے ساتھ یاد کرتے ہیں اور ان سب کے لیے محبت کے جذبات رکھتے ہیں۔

جہاں کی ساری بہاروں سے خوبصورت ہیں
ہمارے اپنے یہ برگ و سمن وطن والو

زمانے بھر سے ملائم ہیں نرم ونازک ہیں

زبانیں اپنی یہ اپنے سخن وطن والو (۲۴)

۶۔ تہذیبی و ثقافتی تنوع:

تہذیبی و ثقافتی تنوع سے مراد ایک معاشرت میں مختلف افراد یا گروہوں کی مختلف زبانیں ،عادات ، روایات اور سوچ سمجھ کا متنوع نظام ہے۔پاکستانی اور مغربی تہذیبوں کا اگر غائر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں تہذیبوں کا ثقافتی تمدنی، اقتصادی، تعلیمی، مذہبی، سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی نظام ایک دوسرے کے تصادم ہے۔مغرب میں صنعتی انقلاب کے بعد سرمایہ درانہ نظام نے جاگیر داری نظام کو ختم کر کے جاگیر دار کی جگہ بزنس مین کو متعارف کروایا۔جو ایک نئے دردِ سر سے کم نہیں۔مغربی تہذیب کے نمایاں پہلو میں جسم وروح کی جدائی، وطنیت اور قومیت ، مذہب وسیاست کی ثنویت ، عقلیت اور دہریت ، مغربی سامراج اور نو آبادیاتی نظام ، محنت و سرمایہ کی کشمکش، مادیت اور ظاہر پرستی شامل ہے۔پاکستان ایک اسلامی ملک ہے۔اس کی تہذیب وثقافت کی خصوصیات تقریبا وہی ہیں جو اسلامی تہذیب کی ہیں۔ان میں توحید، ختم نبوت کی تہذیبی جہت ، مذہب کا کردار، حقیقت کی روحانی ماہیت ، تصور تقدیر، تصور کائنات ، خیر و شر میں فرق، روح و مادہ کی وحدت، تصور زماں اور عالمگیریت وغیرہ شامل ہے۔

پاکستان دنیا میں ایک تیسری دنیا کا درجہ رکھتا ہے۔جو اقتصادی حوالے سے انحطاط کا شکار ہے۔سیاسی اور معاشی عدم استحکام نے ملک کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے۔ملک کا ایک بڑا طبقہ ملکی حالات کے پیشِ نظر یورپین ممالک میں ہجرت کرنے کو ترجیح دیتا ہے۔انہی ممالک میں ایک ملک برطانیہ ہے۔برطانیہ منتقلی کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اس سامراجی قوت نے برصغیر میں اپنا نو آبادیاتی نظام ایک صدی تک قائم کیا رکھا۔جس کے مابعد اثرات یورپین ممالک میں ہجرت کی صورت میں اب تک جاری ہیں۔پاکستان سے ہجرت کرنے والے تارکینِ وطن برطانوی تہذیب و ثقافت سے ہم آہنگی پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔اس معاشرتی تعامل میں تہذیبی و ثقافتی تنوع پیدا ہوتا ہے۔اس معاشرے میں پاکستانی تارکین وطن اقتصادی اور مادی حوالے سے تو خوشحال ہو جاتے ہیں لیکن روحانی اور اخلاقی حوالے سے عدم اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔جس سے ان میں شدید قسم کا ناسٹلجیا پیدا ہوتا ہے ایسے میں وہ اپنے ملک کی تہذیب و ثقافت کو یاد کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

> ”برطانوی اردو نظم میں وہاں کی تہذیب و ثقافت اور طرز معاشرت کے نقوش واضح ہوئے ہیں ۔برطانوی معاشرہ اقتصادی اور مادی حوالوں سے تمام آسائشوں سے مزین نظر آتا ہے۔لیکن اخلاقی اور روحانی اقدار کے حوالے سے یہ معاشرہ زوال کا شکار ہے۔“(۲۵)

احمد مشتاق کی شاعری میں محب اور محبوب کے روایتی مکالمے کے ذریعے نئی معاشرت کی تہذیبی عکاسی ملتی ہے۔ جس میں محب مشرقی تہذیبی روایت جبکہ محبوب مغربی تہذیبی روایت کا عکاس ہے۔ مغربی اقدار میں رکھ رکھاؤ اور شائستگی سے زیادہ مادی خواہش کے لیے بد تہذیبی، مکاری اور حیلے بہانے کو اہمیت دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ وہاں کے شہری کام کاج میں اس قدر مگن ہوتے ہیں کہ ان کے پاس سچے جذبوں کے اظہار کا وقت نہیں بچتا۔ اس کے بر عکس پاکستانی تہذیب میں رکھ رکھاؤ اور شائستگی موجود ہے۔ جہاں جذبات و احساسات کی قدر کی جاتی ہے۔ احمد مشتاق اسی تہذیبی اقدار کو محب کے کردار کے ذریعے مغربی تہذیب میں تلاش کرتے ہیں۔ اور عاشق سے اسی تہذیب کی امید رکھتے ہیں۔ لیکن مغربی محبوب کا رویہ ہمیشہ سے نارواں رہا ہے۔ جس کے پاس اپنے محبوب کے لیے وقت کی شدید قلت رہتی ہے جس کی وجہ سے وہ حیلے بہانے کا سہارا لیتا ہے۔ اس کی ایک اور صورت یہ بھی کھلتی ہے کہ مغرب میں ایک سے زیادہ عاشق رکھے جاتے ہیں اور اس میں فخر محسوس کرنے کی ایک اپنی تہذیبی جہت موجود ہے۔ جب اس سے دل بھر جائے تو کسی اور کے ساتھ تعلق قائم کر لیا جاتا ہے۔ ایسے ماحول میں پاکستانی تارکین وطن کو مادی ضروریات تو حاصل ہو جاتی ہیں لیکن روحانی سکون میسر نہیں آتا۔

میں نے کہا کہ دیکھ یہ میں یہ ہوا یہ رات
اس نے کہا کہ میری پڑھائی کا وقت ہے (۲۶)

اس بے حسی کے عالم میں احمد مشتاق مغربی تہذیب میں مشرقی تہذیبی روایات کو یاد کرتے ہیں۔ جس کی نشاندہی مذکورہ بالا پیراگراف میں کر دی گئی ہے۔ اس روایت میں محب اور محبوب کے کرداروں میں مشرقی اقدار کا پاس موجود ہے۔ جہاں محبوب کے رسوا ہو جانے کے ڈر محب کو لگا رہتا ہے۔ اس ڈر و خوف کی وجہ سے محبت کے کھلم کھلا اظہار کو جرم سمجھا جاتا ہے۔ اور محبوب کی حرمت پر کسی قسم کی آنچ نہیں آنے دی جاتی۔ اس حرمت کو بحال رکھنے کے لیے موت تک کو گلے لگانے سے دریغ نہیں کیا جاتا۔

ہم ان کو سوچ میں گم دیکھ کر واپس پلٹ آئے
وہ اپنے دھیان میں بیٹھے ہوئے اچھے لگے ہم کو (۲۷)

تہذیبی تنوع کی ایک جہت زبان بھی ہے۔ بین الاقوامی سطح پر انگریزی زبان کو اہمیت حاصل ہے۔ تارکین وطن عموماً انہیں ممالک کے باشندے ہیں جہاں انگریز نے ایک عرصے تک اپنی حاکمیت قائم رکھی۔ اس حاکمیت کی وجہ سے مقامی باشندوں میں اعلیٰ و ادنیٰ کی سوچ پیدا ہوئی۔ جس کی وجہ سے وہ اپنی زبان سے متنفر ہو کر برٹش زبان کو ترجیح دینے لگے۔ اس کے علاوہ تیسری دنیا کے ممالک میں آزادی کے بعد بھی نظام تعلیم تک انگریزی زبان میں

موجود ہے۔ جس سے ان قوموں میں احساس کمتی کے جذبات کھل کر سامنے آتے ہیں۔ تارکین وطن کی نئی نسل کی اگر بات کی جائے تو وہ کسی حد تک اپنی زبان سے آشنا نہیں رہے۔ جو تارکین وطن کو پریشان کیے رکھتی ہے۔ لیکن دوسری طرف اگر نگاہ دوڑائی جائے تو زبان میل جول سے ہی پھولتی پھلتی ہیں۔ بالخصوص اردو زبان دیگر زبانوں کے اثر کو قبول کرتی آئی ہے جس سے ذخیر الفاظ کا تنوع دیکھنے میں آیا ہے۔ احمد مشتاق کی شاعری میں انگریزی زبان کا استعمال بھی ملتا ہے۔

فٹ پاتھ پہ سونے نہ دیا ترے شہر کے عزت داروں نے
ہم کتنی دور سے آئے تھے اک رات بسر کرنے کے لیے (۲۸)

برطانوی معاشرے میں دولت کی فراوانی ہے۔ ہر شخص پیسے کی دوڑ میں بھاگتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ان کا ایمان ہے کہ خوشی پیسے سے خریدی جاسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دن رات کارِ دنیا میں لگے رہتے ہیں۔ جس میں وہ جائز اور ناجائز میں امتیاز کرنا بھول جاتے ہیں۔ پاکستانی تارکین وطن ایک اپنا تہذیبی و ثقافتی پس منظر رکھتے ہیں جس میں دھن دولت آنے جانے کی چیز ہے۔ انسانی جذبے اہمیت رکھتے ہیں۔ لیکن ساقی فاروقی کی شاعری میں ان پاکستانی تارکینِ وطن کے جذبات کا اظہار ملتا ہے جو نئی معاشرت میں اپنی تہذیبی پس منظر کو پس پشت ڈال کر حرص وہوس کے پوجاری بن جاتے ہیں۔

سنا ہے زندہ ہوں حرص و ہوس کا بندہ ہوں
ہزار پہلے محبت گزار میں بھی تھا" (۲۹)

اردو شاعری میں اکبر الہ آبادی کے بعد سب سے زیادہ انگریزی الفاظ منصور آفاق کی شاعری میں ملتے ہیں۔ یہ الفاظ اپنی نشست برخاست کے حوالے سے اردو کے روزمرہ اور ضرب المثل میں رواج پاتے جارہے ہیں ۔ جس سے نہ صرف زبان میں وسعت آرہی ہے بلکہ اردو شاعری کا دامن بھی وسیع ہو رہا ہے۔ یہ الفاظ اکیسویں صدی کے انسان کے جذبات واحساسات کے اظہار کے لیے وسیلہ بن رہے ہیں۔ زبان کے تجربات ان کی شاعری میں شعوری ہونے کے ساتھ ساتھ برطانوی ماحول میں غیر شعوری طور پر زبانوں کے تنوع کا نتیجہ بھی ہیں۔

رقص کرتی لڑکیاں میوزک میں تیزی اور شراب
نیکیاں ملتی ہیں مجھ سے کیوں بدی کے بھیس میں (۳۰)

آشنا سالگتا ہے اپنی پرُخواب چاپ سے کوئی

ہے مرے تعاقب میں، نیند کے بس سٹاپ سے کوئی (۳۱)

یہ خواب جنہیں اوڑھ کے سوتا تھا نگر کو
فٹ پاتھ پہ بچھتے ہوئے بستر کی طرح ہیں (۳۲)

رات کے بوٹ کی تم تو تاریخ ہو
اک غلط روٹ کی تم تو تاریخ ہو (۳۳)

اپنے خالق کی بھی تفہیم وہ رکھ سکتا تھا
مجھ سے مت پوچھ کہ روبوٹ کی دانش کیا تھی
ناچتی پھرتی تھی اک نیم برہنہ ماڈل
خالی بوتیک تھا کپڑوں کی نمائش کیا تھی (۳۴)

کسی کو فتح کیا میں نے پیاس کی رت میں
اڑے جو کارک تو شمپین جسم پر چھلکی (۳۵)

کس نے بنایا وقت کا پہلا کلوز شارٹ
آنکھوں کے کیمرے کے فسوں کار زوم سے (۳۶)

بنا رہا ہے جو قوسِ قزح کی تصویریں
دکھائی دے مجھے بادل کے کارنس پہ وہ ہاتھ
کسی کو خواب میں شاید پکڑ رکھا تھا کہیں
جمے ہوئے تھے مسہری کے میٹرس پہ وہ ہاتھ (۳۷)

ہم نفس کیا ہوا سوئمنگ پول
پانیوں میں حواس اگ آئے (۳۸)

۷۔ قدیم آبائی وطن:

انسان کی جنم بھومی جس خطے یا علاقے سے ہوتی ہے اس سے محبت انسانی سرشت میں شامل ہوتی ہے۔ جہاں کی ہر شے اس کے لیے مانوس ہوتی ہے۔ ہر ایک چیز میں اس کو اپنائیت محسوس ہوتی ہے۔ وہ اس وطن سے بے لوث محبت رکھتا ہے۔ ایسی محبت جو دنیا کا ایک انمول رتن ہے۔ یہ محبت اس وقت شدت اختیار کرتی ہے جب پردیس میں

رہنے کا اتفاق ہوتا ہے۔ پردیس میں آبائی وطن کی یاد تارکین وطن کو بے کل کیے رکھتی ہے۔ جو ناسٹلجیا کی صورت میں وقوع پذیر ہوتی ہے۔ جس میں تارکین وطن اپنے آبائی وطن کی تہذیب و ثقافت ،گلی کوچے ،بازار و شہر، موسموں کا تغیر اور قدرتی مناظر کو یاد کرتے ہیں جن سے ان کی ذہنی یا جذباتی ہم آہنگی رہی ہے۔ وہ اسے دوبارہ دیکھنے کے متمنی ہوتے ہیں۔ لیکن چاہتے ہوئے بھی مادی جکڑ بندیوں سے چھٹکارا حاصل نہیں کر پاتے تاکہ اک نگاہ اسے دوبارہ دیکھ سکیں۔

احمد مشتاق کی شاعری میں قدیم آبائی وطن ،اس کے شہروں، بستیوں اور ان بستیوں کی کچی پکی گلیوں، اونچے نیچے مکانات ،وہاں کے موسموں کا تغیر اور تہذیب و ثقافت کا اظہار جابجا ملتا ہے۔ دیار غیر کی چمکتی دمکتی معاشرت میں ہونے کے باوجود آبائی وطن کی یادان کے لاشعور کا حصہ بن چکی ہے جو تخلیقی صورت اختیار کر کے اظہار کا حصہ بنتی ہے۔ اور ان کے اندر آبائی وطن پلٹنے کی خواہش کو بیدار کرتی ہے۔ مذکورہ شعر میں انہوں نے چاندنی کو محبت اور خوشیوں کے استعارے کے طور پر برتا ہے۔ نیز لفظ چاندنی میں شعری جمالیات اور گہری معنویت بھی موجود ہیں۔ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس زمانے کو یاد کرتے ہیں جب ان کی آبائی بستیوں میں رونقیں بحال تھی ۔لوگ ایک دوسرے کی خوشیوں میں دھمالیں ڈالتے تھے۔ سبھی امن اور محبت کے ساتھ رہتے تھے۔ لیکن اس کے برعکس جس معاشرت میں شاعر اب سانس لے رہا ہے وہاں محبت اور خوشیاں دروازوں کے باہر دست بستہ کھڑی رہتی ہیں۔ دست بستہ کھڑے ہونے کی ایک بڑی وجہ وہاں کی مادی زندگی ہے۔

پہلے در آتی تھی جب بستی میں آتا تھا کوئی
اب کھڑی رہتی ہے دروازوں کے باہر چاندنی[۳۹]

ساقی فاروقی کو آبائی وطن اور اس کا شہر کراچی برطانیہ جا کر بھی نہیں بھولا۔ کراچی شہر سے ان کو دلی وابستگی رہی ہے۔ ایک زمانہ تھا ملک کا سب سے بڑا سرمایہ یہی شہر پیدا کرتا تھا۔ لیکن گردش حالات نے روشنیوں کے شہر کو تاریکی میں ڈوبو دیا۔ دہشت گردی، قتل غارت اور لوٹ گھسوٹ نے شہر کے امن کو خراب کیا۔ کسی ملک یا شہر کا سرمایہ اس کے ہنر مند، تاجر اور محنت کش طبقہ ہوتا ہے۔ لیکن گردشِ حالات کے پیش نظر شہر سے تاجر، ہنر مند اور محنت کش طبقے نے ہجرت کر لی۔ یہ ہجرت خوش دلی سے نہیں بلکہ گردش حالات کے پیش نظر کی گئی۔ شہر کی تمام تر رونقیں انہی لوگوں سے آباد تھیں۔ ساقی فاروقی رقمطراز ہیں:

"کراچی میں میری غربت بڑھ گئی تھی کہ مجھے اپنی بے حرمتی نظر آنے لگی تھی ۔ میں فکرِ معاش میں تمام عمر ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں فکرِ معاش میں تمام عمر ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ پہلے تو مجھ پر رزق کا حلقہ تنگ کیا اور جب حصولِ رزق کے سلسلے میں یہاں بس گیا تو اب الزام یہ ہے کہ میں مغرب کا آدمی ہوں۔

باغ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں

کارِ جہاں دراز ہے، اب مرا انتظار کر

پھر مغرب میں رہنے سے آدمی مغرب کا نہیں ہو جاتا۔ اردو شاعری میری عظیم محبت ہے۔ کراچی، لاہور اور دلی میرے خمیر میں ہیں۔ روح پاک وہند میری ذات ہے۔"(۴۰)

ساقی فاروقی فکر معاش میں ملک سے خفا ہو کر برطانیہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں جا بیٹھے ہیں۔ شہر خالی ہونے سے ایک سناٹا چھا چکا ہے۔ جس کو وہ برطانیہ میں محسوس کر رہے ہیں۔ اپنے آبائی وطن سے بے لوث محبت اب بھی رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ کراچی شہر کی یاد اور اس کی طرف مراجعت ان کی شاعری میں ناسٹلجیائی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

آج خاموش ہیں ہنگامہ اٹھانے والے

ہم نہیں ہیں تو کراچی ہوا تنہا کیسا(۴۱)

منصور آفاق کی شاعری میں آبائی وطن اور اس کے گلی کوچوں سے بے لوث انسیت کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ جو غریب الوطنی کی زندگی میں ناسٹلجیا کی صورت میں وقوع پذیر ہوئی ہے۔ یہ یادیں ان کے اندر ایک ایسی تڑپ پیدا کرتی ہیں جو آبائی وطن کی سمت مراجعت کی تمنا کو ہوا دیتی ہیں۔ میانوالی شہر تو ان کے اندر رچا بسا ہوا ہے۔ میانوالی کی گلیاں کوچے، چمنیوں سے نکلتے دھوئیں اور مکانات، خوشگوار موسم، سرسبز کھیت کھلیان اور ساربانوں کے گیت ان میں ایک اضطراب پیدا کیے ہوئے ہیں۔ یہ مناظر برطانیہ جیسے ملک میں دیکھنے کو نہیں ملتے۔

کیا ابھی نکلتا ہے ماہ تاب گلیوں میں

کچھ کہو میانوالی آسمان کیسے ہیں

کیا قطار اونٹوں کی چل رہی ہے صحرا میں

گھنٹیاں سی بجتی ہیں، ساربان کیسے ہیں

چمنیوں کے ہونٹوں سے کیا دھواں نکلتا ہے

خالی خالی برسوں کے وہ مکان کیسے ہیں

اب بھی وہ پرندوں کو کیا ڈراتے ہیں منصور

کھیت کھیت لکڑی کے بے زبان کیسے ہیں(۴۲)

منصور نہیں بھولا میانوالی کی گلیاں

اے بادِ صبا اس دلِ ناشاد سے کہنا(۴۳)

۸۔ گزرے لمحوں کی بازآفرینی:

حال سے بیزاری تارکینِ وطن میں گزرے لمحوں کی بازآفرینی کی جستجو کو پیدا کرتی ہے۔ اس کیفیت میں تارکینِ وطن حال سے کٹ کر اپنے ماضی میں پناہ گزیں ہوتے ہیں۔ اس ماضی میں وہ ایسے واقعات، تجربات اور لمحات کو تلاشتے ہیں جو ان کے لیے راحت و سکون کا موجب بنتے ہیں۔ وہ ان تمام واقعات اور لمحوں کو حال میں دیکھنے کے خواہاں ہوتے ہیں۔ جو ماضی کے تجربات سے سیکھ کر ذات کی تشکیل نو کریں۔ وہ ایسی غلطیاں دوبارہ نہیں کرتے جس سے ان کو نقصان پہنچے۔

پاکستانی تارکینِ وطن ترقی یافتہ مادیت پرست معاشروں میں مادی آسائشوں اور بہترین ماحول کو حاصل کرنے میں تو کامیاب ہو چکے ہیں لیکن مغربی زندگی سے بیزار نظر آتے ہیں۔ مغربی معاشرہ اخلاقی اور روحانی اقدار کے حوالے سے زوال پذیر ہو چکا ہے۔ مادی تصورِ حیات نے نظامِ اقدار ختم کر دیا ہے۔ جس کا اظہار برسوں پہلے اقبال نے بھی کیا تھا۔ بظاہر مغرب انسان دوست معاشرہ ہے۔ جو ہر طرح کی تفریق سے بالا ہو کر انسانیت کے بارے میں سوچتا ہے۔ لیکن یہ سب گفتگو کی حد تک خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ تارکینِ وطن اس ماحول میں نسلی تعصب کا شکار دکھائی دیتے ہیں۔ مادی آسائشوں کی جستجو نے طرزِ زندگی کو بناوٹی بنا دیا ہے۔ ہر شے مصنوعی معلوم ہوتی ہے۔ انسان کے پاس وقت کی شدید قلت ہے۔ ہر شخص کام میں مصروف دکھائی دیتا ہے۔ وہ اس ماحول میں خود کو روبوٹ محسوس کرتے ہیں۔ جو جذبات و احساسات سے عاری ہے۔ یہ انسان مظاہرِ فطرت سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ مذکورہ بالا محرکات پاکستانی تارکینِ وطن میں حال سے بیزاری کا موجب بنتے ہیں۔ وہ حال سے آنکھیں چرا کر ماضی میں اپنے حال کو تلاش کرتے ہیں۔ پاکستانی معاشرہ میں گوناگوں مسائل کے باوجود اخلاقی اور روحانی اقدار اب بھی موجود ہیں۔ مادی آسائشوں نے اس خطے کو بھی اپنی لپیٹ میں لیا ہے لیکن اس معاشرے میں انسانی قدریں کسی حد تک مضبوط ہیں۔ لوگ اب بھی ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں۔ مذہبی اور قومی تہواروں میں اکھٹے ہوتے ہیں۔ پاکستانی تارکینِ وطن اس ماضی کو حال میں دیکھنے کے متمنی ہیں۔

احمد مشتاق کی شاعری تہذیبی زوال کی نشاندہی کرتی ہے۔ یہ زوال وقت کے جبر کا شکار ہوا ہے۔ ان کی شاعری میں ہر شے وقت کی مرہونِ منت معلوم ہوتی ہے۔ وقت کا یہ احساس اذیت ناک صورتِ حال اختیار کرتا

ہے۔ صنعتی ترقی نے اس تہذیب کو معدوم کر دیا ہے جہاں وقت کے گزرنے کا احساس ہوتا تھا۔ انسانی قدریں مضبوط ہوتی تھی۔ لوگ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتے تھے۔ مذہبی اور قومی تہواروں کو مل جل کر منایا کرتے تھے۔ لیکن اب یہ سب دیکھنے کو نہیں ملتا۔ احمد مشتاق اپنے ماضی اور اس کی تمام تر کیفیات میں گم اس زمانے کو تلاشنے کی سعی کرتے ہیں ۔ جہاں ان کے خوشگوار دن اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمکتے دمکتے ہیں۔ اس تلاش کے بعد وہ اس زمانے کو حال میں بھی دیکھنے کے خواہاں نظر آتے ہیں۔

تم جو تارے توڑ لاتے تھے فرازِ چرخ سے
تم میں ہمت ہے کسی ڈوبے ہوئے دن کو بلاؤ(۴۴)

اچھے دنوں کی آس نہ چھینو
یہی تو ایک دیا جلتا ہے(۴۵)

احمد مشتاق کی شاعری غزل کے محاورے حسن و عشق کے ذریعے معاشرتی تہذیب کے عروج و زوال کا پتا حال کے آئینہ میں لگاتی ہوئی ملتی ہے۔ حسن عروج کا استعارہ ہے جبکہ عشق دائمی جذبہ ہے۔ ان دونوں کا تضاد روز اول سے رہا ہے۔ احمد مشتاق اپنے حال میں اس تضاد پر تمسخر اڑاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ تمسخر دراصل اپنے ماضی کے معاشرتی تہذیبی زوال پر اڑایا جا رہا ہے۔

معراج رعنار قمطراز ہیں:

> "احمد مشتاق جمالیاتی حسیت کے شاعر ہیں اس لیے شاعری میں انہوں نے معاشرتی تہذیب کے انہیں پہلوؤں سے سروکار رکھا ہے جن سے حسن و عشق کے عروج و زوال کی داستان منسلک رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماضی اور اس کی تمام کیفیات کو شاعر حال میں دریافت کرنے کا آرزومند نظر آتا ہے۔ حال کے ہر واقعے سے وہ ماضی کے ان گوشوں تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے جن سے کبھی اس کی ذہنی اور جذباتی وابستگی قائم تھی۔"(۴۶)

نئے دیوانوں کو دیکھیں تو خوشی ہوتی ہے
ہم بھی ایسے ہی تھے جب آئے تھے ویرانے میں(۴۷)

برطانوی معاشرے نے ساقی فاروقی کے اندر اجنبیت و بیگانگی کے احساس کو پیدا کیا ہے۔ اس احساس میں وہ اپنا تشخص تلاش کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ جس کے لیے وہ ماضی کے حسین ورق کو الٹ پلٹ کرتے ہیں۔ ان ورقوں میں انہیں اپنی شناخت کا پتا ملتا ہے۔ جبکہ یہیں کہیں انہیں اپنے پیاروں کی خوشبو بھی محسوس ہوتی ہے۔ جو گردش حالات نے ان سے چھین لیے تھے۔ ان خوبصورت لوگوں کے ہوتے ہوئے اسے کبھی بیگانگی کا احساس نہیں ہوا۔ لیکن اب شاعر دوبارہ ان تعلقات کو بحال کرنے اور ان کا ساتھ حال میں دیکھنے کا متمنی ہے۔

اپنی کھوئی ہوئی آواز رسائی مانگے
جاں سے الجھا ہے کوئی نغمہ رسیلا اپنا[۴۸]

وہ ایک لمحہ جسے کھو دیا محبت نے
اسے تلاش کروں گا، تجھے بھلادوں گا[۴۹]

میں جس کے پیچھے بھاگا ہوں کسی پاگل کی باس ہے
جاں تیرے دامن کو ترسے دل روئے ترے ساتھ کو[۵۰]

احمد مشتاق کی طرح منصور آفاق کی شاعری میں بھی ہر شے وقت کے جبر کا شکار معلوم ہوتی ہے۔ جس کو انہوں نئے پیرائے اظہار کے ذریعے موضوع بنایا ہے۔ مذکورہ شعر میں عمر کی جیپ کو وقت کے استعارے کے طور پر برتا گیا ہے۔ اس جیپ کی رفتار اس قدر تیز ہے کہ اس کے ٹائر ہر شے کو کچلتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ وقت کے اس حادثے سے کسی شے کو مفر نہیں۔ یہاں تک کہ اس جیپ کے ٹائروں کی ضد میں شاعر خود بھی آیا ہے۔ جس کا ادراک اسے اپنے جسم پر پڑتی جھڑیوں سے ہوا ہے۔ یہ جھڑیاں ان ٹائروں کے نشانات ہیں جہنوں نے اسے کچلا ہے۔ یہ نشانات ان کے سامنے ایک جہاں کے دروازوں کو وا کرتے ہیں۔ جہاں ان کا سنہرا ماضی کھڑا ہے۔ ماضی اور اس میں گزری حسین رتیں تو اپنی پوری آب تاب کے ساتھ موجود ہے لیکن اس سے وابسطہ لوگ وقت کے جبر کا شکار ہو گئے ہیں۔ جو پریشان حال دکھائی دیتے ہیں۔ منصور آفاق ان لمحات کو پھر سے گزارنے کے متمنی دکھائی دیتے ہیں۔

جسم پر نقش گئے وقت کے آئے ہوئے ہیں
عمر کی جیپ کے ٹائر تلے آئے ہوئے ہیں
تجھ سے کچھ لینا نہیں، دیکھ! پریشان نہ ہو
ہم یہاں گزری رتیں دیکھنے آئے ہوئے ہیں[۵۱]

۹۔ جمہوری قدروں کی پامالی:

جمہوریت اور جمہوری قدریں ہی کسی بھی ملک کی ترقی کی ضامن ہوتی ہیں۔ لیکن صد افسوس پاکستان کو آغاز سے ہی غیر جمہوری قوتوں نے تنزلی کے دہانے پر لا کھڑا کیا، جس میں جمہوری لوگ بھی برابر کے شریک ہیں۔ ملک میں جمہوری قدروں کی پامالی میں درجہ ذیل عوامل کارفرما ہیں۔ ان میں فوجی مارشل لاء، سول حکومتوں کا ٹوٹنا

اور بننا، آزادی رائے پر بے جا پابندیاں ، جبری گمشدگیاں ، احتساب کے نام پر سیاسی انتقام ، پارلیمنٹ کی بے توقیری ، سیاسی عدم استحکام ، اپوزیشن کی دوغلی پالیسیاں ، اپوزیشن کا رجیم چینج کا حصہ بننا، بنیادی حقوق کی پامالی ، غیر جمہوری قوتوں کے سامنے سر خم ہونا، قومی یکجہتی کا فقدان اور قومی پالیسوں کی شدید قلت شامل ہے۔ یہ عوامل ملک میں جمہوریت پر عدم اعتماد کی فضا پیدا کر رہے ہیں۔ جو ملک کو نا قابل یقین حد تک نقصان پہنچا رہی ہیں۔ پاکستانی تارکین وطن جمہوری نظام پر عدم تحفظ کا اظہار کرتے ہیں۔

ساقی فاروقی کی شاعری میں جمہوری قدروں اور نام نہاد آزادیوں پر گہرا طنز ملتا ہے۔ وہ مشرق اور مغرب کے جمہوری نظام سے بخوبی واقف ہیں۔ لفظ "ہر عہد " سے مراد متحدہ ہندوستان ، بنگال ، پاکستان اور برطانیہ میں شاعر کے گزرے ایام ہیں جس میں اس نے ان معاشروں میں رائج جمہوری نظام کا مشاہدہ کیا ہے۔ اس مشاہدے میں جمہوری اقدار کی دھجیاں اڑتی ہوئی دیکھی ہیں۔ روسو نے کہا تھا "انسان آزاد پیدا ہوا ہے لیکن ہر طرف وہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے "۔ شاعر ان معاشروں میں جمہوریت کے نام پر انسان کے ساتھ ہونے والے ناروا سلوک پر پر لب کشا ہے۔ وہ معاشرے میں حقیقی آزادی اور برابری کا نظام دیکھنا چاہتا ہے۔

میرے ہمراہ وہی تہمتِ آزادی ہے
میرا ہر عہد وہی عہد اسیری نکلا (۵۲)

ہر اہل خوف کو تہمت ہوئی ہے آزادی
کہ ساری عمر گرفتار ایک آن میں ہے (۵۳)

۱۰۔ شہریت کا مسئلہ:

شہریت کسی بھی شہری کا ایک ایسا قانونی حق ہے۔ جس میں اس کو اختیار ملتا ہے کہ وہ اس ملک میں قانونی طور پر رہ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ملک سے بنیادی انسانی ضروریات کو حاصل کر سکتا ہے۔ پسماندہ ممالک میں شہریوں کو ٹیکس ادائیگیوں کے باوجود بنیادی ضرورت تک نہیں ملتی۔ ان شہریوں کو بنیادی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے جینا پڑتا ہے۔ اس قسم کے تیسری دنیا کے لوگوں کا بہترین ممالک کی شہریت حاصل کرنا خواب ہوتا ہے۔ پاکستان کا شمار بھی تیسرے درجے کی دنیا میں ہوتا ہے۔ ملک کو سیاسی ، معاشی اور معاشرتی مسائل کا سامنا ہے۔ انہیں مسائل کے پیش نظر ساٹھ ، نوے اور اکیسویں صدی کی دوسری دہائی میں ایک بڑی تعداد نے یورپین ممالک میں ہجرت کی۔

تار کین وطن کو پہلے مذکوہ ممالک کا ویزہ حاصل کرنا آگ کا دریا عبور کرنے کے مترادف معلوم ہوتا ہے۔ جب یہ دریا عبور کر لیا جاتا ہے تو ایک اور دریا ان کے انتظار میں ہوتا ہے۔ یہ شہریت حاصل کرنا کا مشکل ترین حصول ہے۔ امریکہ اور برطانوی جیسے ممالک میں تارکین وطن کو شہریت کے حصول کے لیے بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ برطانیہ کا قانون چھ طرح کی شہریت دیتا ہے۔ برطانوی شہریت، بیرون ملک مقیم برطانوی شہری، برطانوی شہری، سمندر پار علاقوں کے برطانوی شہری، برٹش سبجیکٹ سٹیٹس اور برطانوی تحفظ یافتہ شخص۔ ان شہریت کو حاصل کرنے کے لیے تارکین وطن کو ایڑی چوٹی کا زور لگانا پڑتا ہے۔ برطانیہ میں مقیم لوگوں میں ہزاروں کی تعداد میں ایسے لوگ ہیں جو پیدائشی طور پر برطانیہ سے تعلق رکھتے ہیں یا ان کا بچپن وہاں پر گزرا ہے۔ باوجود اس کے ان کا امیگریشن سٹیٹس برطانیہ میں تیسرے درجے کا سمجھا جاتا ہے۔ اکثریت قانونی طور پر مقیم ہے لیکن امیگریشن سٹیٹس کی وجہ سے بنیادی حقوق سے محروم ہیں۔ برطانیہ میں پیدا ہونے والے بچہ خود بخود برطانوی شہری نہیں بن جاتا بلکہ اس کے والدین کی امیگریشن سٹیٹس کو دیکھ شہریت دینے کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ جو بچے یہاں پیدا نہیں ہوتے ان کو شہریت کے حصول کے لیے مہنگے سفر کرنا پڑتے ہیں۔ شہریت کے لیے نوجوانوں کو وہاں کے مقامی شہریوں سے شادیاں کرنا پڑتی ہیں۔ امیگریشن سٹیٹس کی وجہ سے ان کے خواب ادھورے رہ جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ۲۰۱۹ء میں اڑھائی سالہ عارضی ویزے کا آغاز کیا گیا جس کے مطابق دس سال برطانیہ میں رہنا ضروری قرار دیا گیا۔ عارضی ویزے کی تجدید کے لیے نئے سرے سے درخواست دائر کرنا پڑتی ہے اور اس کے لیے بھاری رقم ادا کرنا پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ تارکین وطن طلبا کو برطانیہ کے رہائشی طلبا کی بانسبت زیادہ فیس ادا کرنا پڑتی ہیں۔ جس سے ان کو مالی مسائل کا سامنا رہتا ہے۔

تگ و دو کے باوجود اگر تارکین وطن وہاں کی شہریت حاصل کر بھی لیں تو برطانیہ اس بات کا حق رکھتا ہے کہ وہ تارکین وطن اور بالخصوص جو بچے پیدائشی طور پر برطانیہ کے شہری ہیں، ان کی شہریت جب چاہے ختم کر سکتا ہے۔ اس کے لیے برٹش نیشنیلٹی ایکٹ ۱۹۸۱ء اور امیگریشن اینڈ اسائلم ایکٹ ۲۰۰۲ء موجود ہے۔ ان مسائل کا اظہار پاکستانی تارکین وطن شعراء کی شاعری میں ملتا ہے۔

ساقی فاروقی کی شاعری میں ان غریب الدیار تارکین وطن کا دکھ اور احساس شامل ہے۔ جو بے یار و مددگار اجنبی معاشرت میں اپنے ٹھوٹھکانے کے متلاشی دکھائی دیتے ہیں۔ آغاز میں تارکین وطن کو سات سمندر پار اجنبی معاشرت میں ٹھکانے سے لے کر حصول معاش تک مختلف چیلنجز کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ مسائل

اجنبیت کے احساس کو گہرا کرتے ہیں جس میں شناخت جیسا مسئلہ کھڑا ہوتا ہے۔ کیوں کہ بنیادی حقوق جو ایک برطانوی شہری کو حاصل ہوتے ہیں ان سے تارکین وطن کو محروم رکھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تارکین وطن شہریت حاصل کرنے کی ہر ممکنہ کوشش کرتے ہیں۔ تاکہ ان کو برطانوی شناخت حاصل ہو جائے اور ان کی زندگی سہل ہو سکے۔

کہیں پناہ نہیں، کوئی گھر دیا جائے

مجھے زمین سے وابستہ کر دیا جائے (۵۴)

۱۱۔ قدیم گلیوں، چوراہوں اور پرانے رستوں کی خواہش:

جس مٹی میں انسان کی پیدائش ہوئی ہو یا اسکی فضاؤں میں بچپن، لڑکپن اور جوانی کے ایام گزرے ہوں اس کی حسین یادیں تادم مرگ پیچھا نہیں چھوڑتی۔ یہ یادیں اس وقت شدت اختیار کرتی ہیں جب وطن سے دوری اختیار کی جائے۔ جو شدید قسم کے ناسٹلجیائی صورت میں وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ یہ یادیں تارکین وطن کے دل و دماغ کو اپنی مٹھی میں لیے رکھتی ہیں۔ وہ اس محبوب وطن کے گلی کوچوں میں گزرے ایام کو یاد کرتا ہے۔ جہاں یادوں کا انبار اس کا منتظر ہوتا ہے۔ رفتگاں کے ساتھ گزرے خوشگوار اور ناخوشگوار ایام اسے انہی قدیم گلیوں، چوراہوں اور پرانے رستوں میں دوبارہ لوٹ جانے کی خواہش کو بیدار کرتے ہیں۔

پاکستانی تارکین وطن کو یورپین ممالک میں اپنے آبائی شہروں کے گلی کوچے اور چوراہے شدت کے ساتھ یاد آتے ہیں۔لاہور ،اور راولپنڈی جیسے قدیم تاریخی شہر برطانیہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں دیکھنا، دیوانے کا خواب لگتا ہے۔ جہاں کی گلیوں میں دوستوں کے ساتھ آوارہ گردی کرنا، گلی کے نکر پر ایک ساتھ بیٹھ کر قصہ گوئی سے خظ اٹھانا اور دکھ درد میں شہر کے چوراہوں میں جمع ہونے کی ایک اپنی تہذیب ہے۔ جبکہ اس کے برعکس ترقی یافتہ ممالک کے شہر انسانوں کی جگہ ربوٹوں کی مڈبھیڑ سے کھچاکچ بڑھے رہتے ہیں ۔ جو مادی آسائشوں کی دوڑ میں جذبات واحساسات سے عاری ہیں۔ یہاں دوست احباب کے پاس وقت کی شدید قلت ہے ۔ اگر وقت میسر آ بھی جائے تو یہاں کی تہذیب کے مطابق عالی وشان ریستوران اور پارک بیٹھنے کے لیے مناسب سمجھے جاتے ہیں۔ جو بالخصوص تارکین وطن کے دکھ درد کا اظہار کرنے کے لیے ساز گار جگہیں معلوم نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستانی تارکین وطن ان گلی کوچوں، چوراہوں اور پرانے رستوں پر لوٹ جانے کی خواہش کرتے ہیں۔

آبائی سرزمین سے تعلق کو منقطع کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ یہ تعلق چاہے جسمانی ہو یا روحانی۔ دیارِ غیر میں ہجرت کا عذاب جھیلنا بھی آگ کا دریا عبور کرنے کے مترادف ہے۔ مغربی ممالک میں تارکین وطن کی ہجرت ذہنی سے زیادہ جسمانی ہجرت معلوم ہوتی ہے۔ اس ضمن میں احمد مشتاق کی شاعری سچائی کے ساتھ باطن کا اظہار معلوم ہوتی ہے۔ جہاں وہ روحانی طور پر اپنی تہذیب و تمدن اور مٹی سے جڑے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اس مٹی میں ہندوستان کے ان قدیم شہروں، گلی کوچوں اور چوراہوں کی یادیں ہیں جو انہیں بے چین رکھتی ہیں۔ جن میں اول اول دنوں کے یارانے اور ملاقاتوں کے طویل سلسلے شامل ہیں۔ یہ یادیں ان میں مراجعت کی خواہش کو پیدا کرتی ہے۔

انہیں گلیوں میں کھلتے تھے ملاقاتوں کے دروازے
انہیں گلیوں میں چلتی ہیں ہوائیں شامِ ہجراں کی (۵۵)

خشک تالاب ٹوٹی ہوئی سیڑھیاں ادھ کھلے پھول پر سوختہ کھڑکیاں
پھر کوئی شہر آنکھوں میں پھرنے لگا پھر مجھے راستے یاد آنے لگے (۵۶)

ٹھنڈے موسم میں پکارا کوئی ہم آتے ہیں
جس میں ہم کھیل رہے تھے وہ گلی یاد نہیں (۵۷)

علی ارمان کی شاعری برطانوی معاشرے میں محبوب وطن کے گلی کوچے اور پرانے رستوں کی خواہش کے حوالے سے پاکستانی تارکین وطن کے جذبات کی عکاس دکھائی دیتی ہے۔ لفظ "شام "تنہائی اور زوال کا استعارہ ہے۔ جب اس استعارے کو برطانوی معاشرے کے پس منظر میں دیکھتے ہیں تو معلوم پڑتا ہے کہ وہاں کی زندگی مصروف ترین ہے۔ تارکین وطن دن بھر کی تھکن لاد کر جب فلیٹ میں لوٹتے ہیں تو تنہائی انہیں ان کے بستر پر گھیر لیتی ہے۔ ایسے میں محبوب وطن کی گلیاں اور دریچہ آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتے ہیں۔

میری نظر کے سامنے پھرنے لگتے ہیں
تیری گلیاں تیرا دریچہ شام ڈھلے (۵۸)

۱۲۔ فطرت پسندی:

کائنات کے مظاہر جا بجا بکھرے پڑے ہیں۔ فطرت پسندی میں کائنات کے انہی مظاہر کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ نیچر لیسٹ، فطرت نگاری میں فطرت کے اصولوں کے تابع ماحول اور خیالات کو اہمیت دیتا ہے۔ جس میں

کائنات کو سمجھنے کے لیے ماحولیاتی نظاموں، قدرتی مظاہر، پودوں اور جانوروں کا غائر مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ فطرت پسندی کا ایک اہم عنصر اپنے وطن سے محبت ہے۔ وطن سے محبت ایک فطری جذبہ ہے۔ پاکستان سر سبز و شاداب سرزمینوں، کہساروں، دریاؤں، چناروں اور آبشاروں سے مزین ہے۔

صنعتی انقلاب اور صارفی معاشرے نے انسانی خواہشات کو تو تقویت بخشی لیکن فطرت کو بری طرح متاثر کیا۔ اس سے نہ صرف کرہ ارض، مناظرِ فطرت سے محروم ہو رہا ہے بلکہ بنی نوع انسان سمیت تمام مخلوقات کا وجود خطرے میں ہے۔ گلوبل وارمنگ سے ماحول میں ہونے والی تبدیلی کرہ ارض کو لگاتار گرم کر رہی ہے جس سے کاربن ڈائی آکسائڈ فضا کو اپنی گرفت میں لے رہی ہے۔ اس کے نتائج مختلف بحران کی طرف لے جائیں گے۔

ڈاکٹر صبیحہ ناہید رقمطراز ہے:

"موجود تیز رفتار صنعتی ترقی سے پہلے جنگلات کی کثرت اور مظاہر فطرت سے چھیڑ چھاڑ نہ کرنے کی وجہ سے آلودگی کا مسئلہ اتنی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ لیکن اب کارخانوں کی کثرت، صنعتی فضلات کی نکاسی کے مناسب انتظام سے غفلت، آبادی کا پھیلاؤ، آلودگی پیدا کرنے والے ایندھن کا بے دریغ استعمال، درختوں کی بے تحاشہ کٹائی، دریاؤں میں فضلات کا بہاؤ، پر شور سواریوں اور مشینوں کا استعمال، اور اس طرح کے مختلف اسباب ہیں جن کی وجہ سے ماحولیات میں عدم توازن پیدا ہوتا ہے۔"(۵۹)

دیار غیر منتقل ہونے والے پاکستانی تارکین وطن ان صنعتی معاشروں میں مادی زندگی اور ماحول سے اکتا ہٹ محسوس کرتے ہیں۔ اس اکتاہٹ میں ان کو اپنے آبائی وطن کے قدرتی مناظر اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ اردو شعراء نے قلی قطب شاہ سے لے کر ناصر کاظمی تک مناظر فطرت کی طرف توجہ مبذول کروائی ہے۔ تارکین وطن شعراء کی شاعری میں بھی بالخصوص مظاہر فطرت کا اظہار نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ ڈاکٹر شیر علی کہتے ہیں: "۔۔۔ برطانیہ کے بعض شعرا کے ہاں خارجی عناصر اور مظاہر فطرت کی عکاسی لائق تحسین ہے۔"(۶۰)

احمد مشتاق کی شاعری میں فطرت پسندی کا عنصر بھی غالب دکھائی دیتا ہے۔ وہ مغربی ماحول کا گہرا مشاہدہ رکھتے ہیں۔ مغربی صنعتی ممالک نے فطرت کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ کارخانوں اور فیکٹریوں سے نکلنے والا دھواں، ایندھن کا بے دریغ استعمال اور نیوکلیئر پلانٹ فضا میں آلودگی کے ساتھ اوزان کے لیے بھی خطرے کا سبب بن رہے ہیں۔ ایسے ماحول میں قدرتی مناظر ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔ جس سے یہ خدشہ ہے کہ جلد انسان، حیوانات

،نباتات اور جمادات کا وجود ختم ہو جائے گا۔ مناظر فطرت انسان کی روح کو زندگی بخشتے ہیں۔ مغربی ماحول میں کہیں ڈھونڈنے پر کوئی منظر دکھائی بھی دے تو وہ مصنوعی ہوتا ہے۔ ایسے میں احمد مشتاق اپنے آبائی وطن پاکستان کے قدرتی مناظر کو یاد کرتے ہیں۔ جہاں کے مناظر آنکھوں میں جیتی جاگتی تصویر بن کر پھرنے لگتے ہیں۔ جس میں چاند کا شاخوں کی اوٹ میں چھپنا، بادل کی ڈراؤنی گھن گرج اور بوندوں کا ٹپکنا اور بوچھار میں تبدیل ہونا شامل ہیں۔

دبلا پتلا نحیف سا چاند
شاخوں سے پرے گزر رہا تھا
بدلی بوندیں اتارتی تھی
اب چاند رکا ہوا کھڑا تھا
بادل کی گرج ڈراؤنی تھی
چھاجوں پانی برس رہا تھا (۶۱)

ساقی فاروقی کی شاعری میں قدرتی مناظر ناسٹلجیا کی صورت میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ جو انہیں اپنے آبائی وطن کے قدرتی مناظر کی یاد تازہ کروا دیتے ہیں۔ جہاں سرخ پھولوں کے مناظر، دل کو گرفتار کر لیتے ہیں اور ساحل سمندر کا نظارہ آنکھوں کو تفریح کا سامان مہیا کرتا ہے۔ ساقی فاروقی ان مناظر کو جہاں بھر کے مناظر سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اُن کے نزدیک اِن مناظر کو دیکھ لینا، جہاں بھر کی خوبصورتی کو دیکھ لینے کے مترادف ہے۔ سب سے اہم بات وہ ان مناظر کو زنجیر نہیں بناتے۔ زنجیر سے مراد قید نہیں کرتے۔ یعنی ان کو نقصان نہیں پہنچاتے۔ عموماً ترقی یافتہ ممالک نے مناظرِ فطرت کو نقصان پہنچایا ہے۔ جس کی نشاندہی مذکورہ پیراگراف میں کر دی گئی ہے۔ ساقی فاروقی آبائی وطن کے قدرتی مناظر کو آنکھوں میں بھر کر برطانیہ لے آئے ہیں۔ انہیں جب فرصت کے لمحات ملتے ہیں تو وہ ان مناظر سے خط اٹھاتے ہیں۔ جو ان کے قلب و روح کو تازگی پہنچاتے ہیں۔

سرخ چمن زنجیر کیے ہیں نہ سمندر لایا ہوں
میں تو دنیا بھر کے منظر آنکھوں میں بھر لایا ہوں (۶۲)

منصور آفاق کی شاعری میں آبائی وطن پاکستان کی حسین وادیوں کی دلکش جھلک ملتی ہے۔ کیمرج برمنگھم اور ملٹن کینس جیسی وادیاں بھی شاعر کو کشمیر، ناران کاغان اور مری سے خوبصورت معلوم نہیں ہوتی۔ شاعر کو یہ جنت نظیر وادیاں برطانیہ میں شدت کے ساتھ یاد آتی ہیں۔ نیلم کی آبشاریں، ہلمت کی بلندی پر بادلوں کی گھن گھرج، داؤ کھن کی سفید چوٹیاں، دھیر کوٹ کی گلیاں، راولہ کوٹ کے چشمیں، بنجوسہ پائن کے چھتنار درخت اور دریا جہلم کی

موجیں اپنے سحر سے نکلنے نہیں دیتی۔ یہ وادیاں اس کی روح کو تازگی فراہم کرتی ہیں۔ وہ ان وادیوں کی طرف پلٹنا چاہتے ہیں۔

ہلمت کی بے پناہ بلندی پہ تیز آب
پھرتا ہے بادلوں کے دریچوں میں بے قرار
معصوم داؤ کھن کی مقدس سفیدیاں
اک دورِ ھلاں میں رسولوں کا انتظار
اڑتے ہیں دھیر کوٹ کی گلیوں میں برگ وبار
جیسے بدلنے لگتی ہے تہذیبِ برف زار
شبنم کے موتیوں سے بھرا راولہ کا کوٹ
ہر سنگ میں دکھاتا ہے اک چشمِ آب دار
بنجوسہ جیسے آب درختوں کے تھال میں
بس گھومتی ہے روح میں خاموش سی پکار (۶۳)

صنعتی ترقی تیزی سے جنگلات کا خاتمہ کر رہی ہے اوران کی جگہ کارخانوں، فیکٹریوں اور ہاؤسنگ سوسائٹیوں نے جگہ لے رہی ہیں۔ جس سے آبی، فضائی، برقی، غذائی، زمینی اور بحری آلودگی پیدا ہو رہی ہے جو نہ صرف انسان کے وجود کے لیے خطرے کا باعث بنی ہوئی ہے بلکہ حیوانات، نبادات، جمادات کے لیے بھی جان لیوا ثابت ہو رہی ہیں۔ علی ارمان کی شاعری مظاہر فطرت سے محبت کا اظہار ہے۔ شاعر چونکہ حساس طبقہ ہوتا ہے وہ بے زبان اشیاء کا بھی دکھ درد سمجھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں برطانیہ جیسے صنعتی معاشرے میں پرندوں کے جذبات و احساسات کا ادراک ہو رہا ہے۔ جو اس صنعتی معاشرے سے نفرت کا اظہار کر رہے ہیں۔ اس نفرت سے شاعر کو وہ زمانہ یاد آرہا ہے جب آبائی وطن میں پرندوں سے عقیدت کا رشتہ ہوتا تھا۔

ہمیں پرندے کتنے پیار سے تکتے تھے
ہم جب ان کے سامنے پانی رکھتے تھے (۶۴)

۱۳۔ اجنبیت کا احساس:

دیارِ غیر بالخصوص برطانیہ اورامریکہ کی تہذیب وثقافت، زبان وبیان، مذہب اور سماجی واخلاقی اقدار مشرق سے جدا ہیں۔ مشرقی تارکین ایک عرصے سے وہاں کی سوسائٹیوں میں مقیم ہیں۔ وہ اعلی وارفع معاشروں میں

منتقلی کے باوجود وہاں کے اصول وضوابط، ثقافت، اقدار سے خود کو مربوط کرنے میں ناکامی کا سامنا کر رہے ہیں۔ یہ ناکامی ان میں اجنبیت کو شد و مد سے محسوس کرواتی ہے۔ جس سے ڈر اور خوف ان کی روح میں سرایت کر جاتا ہے۔ جس سے ایک اضطرابی اور بے چینی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ یہ معاشرے میں عدم توازن کے سبب ہے۔ جس سے تارکین وطن میں قوت ارادی ختم ہو جاتی ہے۔ مقصد، ہدف اور منزل کی سمت کی جستجو دم توڑ دیتی ہے۔ زندگی بے معنی شے لگنے لگتی ہے۔ مستقبل کا خوف تارکین وطن کو اپنے وجود کے بارے سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ جس سے ان کا وجود مسخ ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ اسی بیگانگی اور اجنبیت میں اپنی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ تلاش مزید الجھاؤ اور بوریت کا سبب بنتی ہیں۔ یہ اجنبیت اب ایک الم ناک صورت اختیار کر چکی ہے۔ جس کا شکار ہر دوسرا تارکین وطن ہے۔ ماحول میں اجنبیت اور بیگانگی کا احساس ناسٹلجیا کو جنم دیتا ہے۔

ڈاکٹر شیر علی رقمطراز ہیں:

"برطانوی ماحول میں برصغیر پاک وہند کے فرد کے ہاں اجنبیت کا تصور ایک الم ناک تصور ہے۔ بعض شعرا کی شاعری برطانوی ماحول میں برصغیر پاک وہند کے فرد کی اجنبیت کا نوحہ معلوم ہوتی ہے۔ اجنبیت کا یہ آسیب اس قدر وسعتوں کا حامل ہے کہ انسان بعض اوقات اس اجنبی ماحول میں خود اپنے ہی گھر کے نقوش کرنے کی سعی لاحاصل کر رہا ہے۔"(۶۵)

احمد مشتاق کی شاعری عصری حسیات کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ وہ موجود منظر نامے میں اقوامی اور بین الاقوامی سطح پر درپیش مسائل سے بخوبی آگاہ ہیں۔ تارکین وطن جب نوع نوع مسائل سے نبرد آزما ہونے میں ناکامی کا سامنا کرتے ہیں تو اجنبیت اور بیگانگی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس اجنبیت اور بیگانگی میں وہ اپنے ہم وطنوں کو تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ لیکن اتنے بڑے شہروں میں ہم وطنوں کو تلاش کرنا کوئی معمولی کام نہیں۔ کیوں کہ بڑے شہروں میں ایک جیسی عمارتیں اور مکانات کا کلچر ہے۔ جہاں کسی ہم وطن سے ملنے کے لیے اس کا مکمل پتہ ہونا ضروری ہے۔ احمد مشتاق بغیر پتے کے اپنے ہم وطنوں کو تلاش کرنے کے لیے مارے مارے پھرتے ہیں۔ اجنبی شہروں میں یہ تلاش ان میں مراجعت کی خواہش کو پیدا کرتی ہے۔ پردیس میں اگر کوئی ہم وطن مل جائے تو اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس پاکستان میں چھوٹے چھوٹے شہروں اور مکانات میں کسی کو تلاش کرنا نہایت آسان ہے۔ جا بجا آشنا چہرے دکھائی دیتے ہیں۔ احمد مشتاق ان چھوٹے شہروں اور مکانات کو ترقی یافتہ ممالک میں تلاشتے ہیں۔

اجنبی لوگ ہیں اور ایک سے گھر ہیں سارے
کس سے پوچھیں کہ یہاں کون سا گھر اس کا ہے(۶۶)

برطانیہ کی معاشرت سے پاکستانی تارکین وطن کی عدم مطابقت کی بڑی وجہ زبان و بیان، تہذیب و ثقافت ،مذہب ،اخلاقی اقدار وغیرہ شامل ہیں ۔ جس نے پاکستانی تارکین وطن میں اجنبیت و بیگانگی کو جنم دیا ہے۔اس اجنبیت و بیگانگی میں تنہائی کا شدید احساس ہوتا ہے۔روزمرہ کی زندگی اس قدر مصروف ہوتی ہے کہ کسی ہم وطن سے ملنا ملانا بھی نہیں ہوتا۔ہم وطن تو دور کی بات ہے کئی کئی دن اپنا چہرہ بھی آئینے میں دیکھنے کا وقت نہیں ملتا۔اگر وقت مل بھی جائے تو اپنی شناخت کرنا آسان نہیں ہوتا۔منصور آفاق کی شاعری میں اس کشش و پنج کی عکاسی ملتی ہے۔

اجنبی ہے کوئی اپنا نہیں لگتا مجھ کو
یہ تو منصور کا چہرہ نہیں لگتا مجھ کو[۶۷]

۱۴۔ازلی وابدی نارسائی:

برصغیر کے باشندوں میں ازلی وابدی نارسائی کا احساس گہرا ہے۔جس کے پس منظر میں برصغیر کی سیاسی تاریخ کارفرما ہے۔برصغیر کی دو بڑی قومیں ہند اور مسلم ہیں۔انہوں نے نوآبادیاتی نظام سے چھٹکارے کے لیے جنگِ آزادی لڑی تھی۔جنگ میں ناکامی ایک نہ ختم ہونے والی تاریکی کا سبب بنی۔جنگ آزادی کے بعد برصغیر براہ راست برطانیہ کے ماتحت چلا گیا۔جس نے دونوں قوموں میں مایوسی کی فضا پیدا کیں۔ہندو اور مسلم جنگ کے بعد یہ سمجھ چکے تھے کہ برطانیہ سے آزادی کا واحد رستہ سیاسی جنگ ہے۔جس کے نتیجے میں کانگرس اور مسلم لیگ کا قیام عمل میں لایا گیا۔

بیسویں صدی کے اول میں ایسے حالات پیدا کیے گئے کہ برطانیہ ملک چھوڑنے پر راضی ہو گیا۔اس دوران آپس کے خلفشار اس قدر بڑھے کہ ملک دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔آزادی کے وقت ایک بڑے پیمانے پر ہجرت ہوئی۔مہاجرین نے ایک نئے ملک کا خواب آنکھوں میں سجائے ہوئے پاکستان کا رخ کیا۔لیکن جلد ہی انہیں اپنے خواب ریزہ ریزہ ہوتے ہوئے دکھائی دینے لگے۔آزادی کے متوالے جیسا سوچ کر آئے تھے نئے ملک میں ایسا کچھ بھی نہیں تھا جو انہیں اطمینان اور سکون پہنچا سکتا۔پچاس سے ساٹھ کی دہائی میں برطانیہ نے مختلف شعبوں میں افرادی قوت کو پورا کرنے کے لیے پاکستان کا انتخاب کیا کیوں کہ پاکستان دولت مشترکہ کا رکن تھا۔پچاس کی دہائی میں میڈیکل کے شعبے میں بڑے پیمانے پر بھرتیاں کیں۔اس کے بعد برطانیہ میں ہجرت کا ایک سلسلہ چل پڑا۔جہاں مادی آسائشیں تو پاکستانی تارکین وطن کو میسر آگئی لیکن گوناگوں مسائل نے بھی جنم لیا۔جس سے تارکین وطن میں قنوطیت کے جذبات پیدا ہوئے اور وہ زندگی سے بیزار دکھائی دینے لگے۔یہ قنوطیت ازلی وابدی ناکامی کا سبب بنی۔

زندگی کی بے ثباتی سے پیدا ہونے والی ازلی اور ابدی نارسائی احمد مشتاق کی شاعری میں ایک نئے طرز احساس کے ساتھ ملتی ہے۔یہ احساس اپنے اندر عالمگیر معنویت رکھتا ہے۔اس کی بیداری میں مغربی چکاچوند معاشرت کارفرما دکھائی دیتی ہے۔زندگی بہت سے آفاقی رنگوں اور ذائقوں سے عبارت ہے لیکن اب رفتہ رفتہ اپنی دلکشی کھو رہی ہے۔یہ تمام رنگ اور ذائقہ تب تک اپنی اصل میں قائم و دائم رہے جب تک اس کا روحانیت سے باہمی ارتباط رہا۔مغربی معاشرت روحانیت سے زیادہ ظاہری حسن پرستی کو اہمیت دیتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ تارکین وطن میں ازلی و ابدی ناکامی کا احساس زندگی سے اکتاہٹ کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے۔انہیں ہر شے فانی دکھائی دیتی ہے۔جو دنیا کی اصل حقیقت ہے۔احمد مشتاق اس احساس کا اظہار زندگی اور موسم، پھول اور خوشبو جیسے آفاقی تعلق کا ایک دن خاتمے کے ساتھ جوڑتے ہیں۔اس کے علاوہ انسان جو اس کائنات کا سب سے پرانہ اور شاہکار باسی ہے اس کے فنا ہونے کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔

زندگی سے ایک دن موسم خفا ہو جائیں گے
رنگِ گل اور بوئے گل دونوں جدا ہو جائیں گے
کتنے پرامید کتنے خوب صورت ہیں یہ لوگ
کیا یہ سب بازو، سب چہرے فنا ہو جائیں گے (۶۸)

ساقی فاروقی کی شاعری میں بھی اسی قسم کا احساس، ڈر اور خوف کی مختلف کیفیات کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے۔یہ ڈر اور خوف بھی برطانوی معاشرت کی ودیعت ہے۔جو وہاں کے شہریوں کو ہر لمحہ لاحق رہتا ہے۔اس ڈر اور خوف کی حالت میں شاعر کو زندگی جیسی بامقصد شے بھی بے کار معلوم ہونے لگتی ہے۔اور یہ سفر بھی تھکن اور اکتاہٹ لیے ہوئے دکھائی دیتا ہے۔شاعر اس سفر کو رات سے تشبیہ دیتا ہے اور سب کو اس تاریک سفر کا مسافر قرار دیتا ہے۔یہ سفر رائیگانی اور لاحاصلی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ان کے نزدیک ہر زندہ شے نے اک دن موت کا لقمہ بننا ہے۔

وہ لوگ جو زندہ ہیں وہ مر جائیں گے اک دن
اک رات کے رہی ہیں، گزر جائیں گے اک دن (۶۹)

اک بلا آتی ہے اور لوگ چلے جاتے ہیں
اک صدا کہتی ہے، ہر آدمی فانی نکلا (۷۰)

منصور آفاق کی شاعری میں روزمرہ کے معاملات سے تنگ آکر اپنے وجود جیسی حقیقت تک تماشا دکھائی دیتا ہے۔ اس تماشے اور تماشائی کے کھیل کا ذکر غالب نے بھی کیا تھا:"ہوتا ہے شب و روز تماشا میرے آگے" ظاہر ہے اس کھیل کے سمجھ آنے کے پیچھے اس عہد کے حالات شامل ہیں۔ اگر غائر مشاہدہ کیا جائے تو معلوم پڑتا ہے کہ صنعتی ترقی کے بعد برطانیہ کے حالات بھی اس حوالے سے سازگار ثابت نہیں ہوئے۔ جس کا احساس بالخصوص تارکین وطن کو ہوا ہے۔ برطانیہ میں پاکستانی تارکین وطن مقامی باشندوں سے زیادہ کام کاج کرتے ہیں۔ جن کا مقاصد اس سوسائٹی میں آرسائش دنیا اور شہریت حاصل کرنے جیسے عوامل شامل ہیں۔ سخت محنت کے باوجود ایک ازلی و ابدی ناکامی کا احساس انہیں رہتا ہے۔ یہ احساس بلند مقاصد، ہدف، منزل کی سمت اور جستجو تک چھین لیتے ہیں۔ جس میں ایسے معلوم ہوتا ہے گویا انسان کا فکر دنیا میں سر کھپانا بے کار ہے۔ لیکن دوسری طرف انہیں وہ زمانے یاد آتے ہیں جب ان کے محبوب وطن میں ہر شے معنی رکھتی تھی۔

میں تماشا ہوں تماشائی نہیں ہو سکتا
یہ فلک فہمی یہ تسخیرِ جہاں کارِ عبث
تیرے ہونے سے مہ و مہر مرے ہوتے تھے
اب تو ہے سلسلہ ء کون مکاں کارِ عبث (۱۷)

۱۵۔ غریب الدیار ہونا:

غریب الدیار ہونا سے وہ حالت مراد لی جاتی ہے جس میں جب کوئی شخص تعلیمی، کاروباری، مزدوری یا سیاسی جبر کی وجہ سے ملک کو خیر آباد کہے۔ ان غریب الوطن کو دیار غیر میں مختلف قانونی، مالی، سماجی و ثقافتی، رہائشی اور صحتی مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جس میں ان کو اپنا ملک شدت سے یاد آتا ہے۔ پاکستانی تارکین وطن کی ایک بڑی تعداد تعلیمی، کاروباری، مزدوری اور سیاسی جبر کی وجہ سے اختیاری اور غیر اختیاری طور پر ہجرت کرتی آئی ہے۔ اس ہجرت میں خلیجی اور مغربی ممالک کی طرف زیادہ رجحان رہتا ہے۔ جہاں تارکین وطن کو غریب الوطن کی کی زندگی جینا پڑتی ہے۔

پاکستانی تارکین وطن کی ایک بڑی تعداد غریب الوطنی کی زندگی یورپ میں گزار رہے ہیں۔ جہاں کے معاشرے میں تارکین وطن کو اجتماعی، روحانی اور نفسیاتی مسائل کا سامنا ہے۔ غریب الوطن شعراء کی شاعری میں ان تارکین وطن کے مصائب، دکھ درد، اور رنج و الم کا اظہار ملتا ہے جو غریب الوطنی کی زندگی میں محسوس ہوتے

ہیں۔اس شاعری میں انسانیت کی غربت، معاشی ناچاکیوں اور عقلی آگاہی کا اظہار بھی شامل ہوتا ہے۔ عموماً اس قسم کی شاعری میں معاشرتی عدم توازن اور ریاستی پالیسوں پر طنز اور مزاحمت ملتا ہے۔

احمد مشتاق کی غزل میں غریب الوطنی کا کرب داخلی بکھراؤ کا سبب بنتا ہے۔ یہ بکھراؤ ان کی شناخت کو بھی مسخ کرتا ہوئے دکھائی دیتا ہے۔ جس میں وہ اپنے تشخص کو تلاش کرتے ہیں۔ اس تلاش میں انہیں اپنی مٹی کی یاد ستاتی ہے۔ وہ مٹی جس سے ان کا اٹوٹ رشتہ ہے۔ لیکن گردش حالات نے ان سے سب کچھ چھین لیا ہے۔ اس دکھ درد اور بے بسی کے عالم میں ان کی آنکھ فرطِ حیرت میں مبتلا ہے۔ جو غریب الوطنی میں آنسو جیسی دکھ درد کی علامت کو بھی بھول گئی ہے۔ یہ آنسو اپنی مٹی کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ جو مشکل حالات میں دعا کی صورت اختیار کر کے نمو کا باعث بنتے تھے۔ اب دیارِ غیر میں شاعر اس مٹی کو تلاش رہا ہے۔

مرے آنسو کی جھلک جس میں تھی

وہ مٹی کدھر کی ہوا لے گئی"(۷۲)

ساقی فاروقی کے ہاں مسافرت اور غریب الوطنی کی زندگی کا دکھ نمایاں ہے۔ تارکین وطن کے ہاں یہ مسافرت اور غریب الوطنی کا دکھ ،خوش دلی سے زیادہ گھریلو حالات کو مدنظر رکھ کر گلے لگایا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ وگرنہ کس شخص کا دل کرتا ہے کہ وہ اپنے کنبہ کو چھوڑ چھاڑ کر سات سمندر پار جا بسے۔ ان تارکین وطن کی تمام تر قربانیاں خاندان کے لیے ہوتی ہیں۔ وہ سالہاسال غریب الوطنی کی زندگی جیتا ہے۔ جہاں اسے طرح طرح کے مصائب والم برداشت کرنا پڑتے ہیں۔ تاکہ کنبہ خوش حال زندگی بسر کر سکے۔ وہ چاہتا ہے کہ اپنے گھر کو واپس پلٹے لیکن مجبوریِ حالات ہمیشہ اس کے آڑے آجاتی ہیں۔ وہ یہ سب دیکھ کر چپ سادھ لیتا ہے۔ حالانکہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ گھر میں اس کے ماں باپ، بہن بھائی اور بیوی بچے اس کا انتظار کر رہے ہیں۔

مجھے خبر تھی مرا انتظار گھر میں رہا

یہ حادثہ تھا کہ میں عمر بھر سفر میں رہا(۷۳)

غریب الوطنی میں مسافر پہلے وطن کے فراق کو گلے لگاتا ہے اور پھر مسافت جیسے اذیت ناک کرب سے گزرتا ہے۔ آخر کار ایک ایسی سرزمین پر پہنچ میں کامیاب ہو جاتا ہے جو اس کے لیے اجنبی ہوتی ہے۔ جہاں اسے زندگی کی نئے سرے سے شروعات کرنا پڑتی ہے۔ یہاں اسے زندگی کو بہتر بنانے کے لیے لاکھ مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ منصور آفاق کی شاعری میں اس غریب الوطن مسافر کے کرب کا اظہار ملتا ہے۔ جو اس قدر دکھ درد جھیل

چکاہے کہ اس کے چہرے سے غریب الوطنی کی داستان بیان ہوتی ہے۔یہ غریب الوطن مسافر ناصح کی شکل اختیار کر جاتا ہے۔اور نئے دیوانوں کو اپنا وحشت بھرا چہرا دکھا کر خواب گاہوں سے جگاتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

مسافرت ہی ہے رنج و محن، وطن والو
کہے یہ بات غریب الوطن وطن والو (۷۴)
دیکھ اے دیدہ عبرت مرے چہرے کی طرف
ایسے وہ ہوتا ہے جو اپنے وطن سے نکلے (۷۵)

۱۶۔اداسی:

غریب الوطنی میں نئی معاشرت سے عدم مطابقت اجنبیت کے احساس کو گہرا کرتی ہے۔ اس اجنبیت میں وطن کی یاداور اپنوں کی جدائی سے پیدا ہونے والی شدت ایک کرب ناکی کی صورت اختیار کرتی ہے۔جو انسان کو ہر لمحے افسردہ و غمگین رکھتی ہے۔اس افسردگی کے کئی ایک اسباب ہوسکتے ہیں۔جن میں معاشی پریشانی،سماجی فرقہ واریت،سیاسی بحرانات،بے وطنی کی تلخیاں،شناخت کا مسئلہ،ناقدری،دو ممالک کے درمیانی فاصلہ،عزیزواقارب سے الگ تھلگ رہنا،مستقبل کے حوالے سے مایوسی،ناکامی کا اعتراف،محبت کی کمی اور بدلتے ہوئے حالات وواقعات شامل ہیں۔جس اداسی کا اظہار تارکین وطن شعراءنے ہجرت سے متعلق استعاروں کی مدد سے جدید پیرائے میں کیا ہے۔

تارکین وطن تمام مادی آسائشیں حاصل کرنے کے باوجود ایک بے رنگ سی اداسی کے زیر اثر رہتے ہیں۔یہ اداسی ان کی شادمانی پر بھی چھائی رہتی ہے۔جس کا سبب تلاش کرنے کے باوجود ان کو نہیں ملتا۔اور نہ اس اداسی کا کوئی حل دکھائی دیتا ہے۔ظاہر ہے یہ اداسی ان کے ہاں وطن سے دوری کے سبب در آئی ہے۔احمد مشتاق کی شاعری میں اسی افسردگی کا اظہار شدت سے ملتا ہے۔اس اداسی کا ارتباط کسی مخصوص موسم سے نہیں۔جیسے کہ عموما بہار کا موسم زندگی اور زندگی سے جڑی شادمانی کی علامت کے طور پر برتا جاتا ہے۔اسی طرح خزاں کے موسم کو افسردگی اور غمگینی کی علامت کے طور پر برتا جاتا ہے۔لیکن مشتاق کی شاعری میں اس ملول کا دور دور تک موسم سے کوئی لینا دینا معلوم نہیں ہوتا۔دنیا کی بھیڑ بھاڑ سے انہیں عجیب سی وحشت ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ وہ سناٹے کی تلاش میں رہتے ہیں۔جہاں وہ یاد کے جزیروں میں ایسی بستیوں کی طرف مراجعت کی خواہش کرتے ہیں جو ان کے قلب و روح کو کسی حد تک سکوں دیتی ہیں۔

جگمگاتے جاگتے شہروں میں رہتا ہوں ملول
سوئی سوئی بستیوں میں شادماں رہتا ہوں (۷۶)

ایک بے رنگ سی اداسی ہے
ایسے موسم میں کیا کرے کوئی (۷۷)

زمیں سے اُگتی ہے یا آسماں سے آتی ہے
یہ بے ارادہ اداسی کہاں سے آتی ہے (۷۸)

کہاں ساری اداسیاں رکھوں
کیسے اس دل کو شادماں رکھوں (۷۹)

موسم گل ہو کہ پت جھڑ ہو بلا سے اپنی
ہم کہ شامل ہیں نہ کھلنے میں نہ مرجھانے میں (۸۰)

شاعر کی داخلی دنیا میں کوئی ایسا موسم ہوتا ہے جو اسے اپنے موجود سے بیزار رکھتا ہے۔ وہ تمام عمر افسردگی کا سبب جاننے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ اس جستجو میں اسے ہمیشہ ناکامی کا سامنا رہتا ہے۔ لیکن لمحہ موجود کی بیزاری بھی اگر اس افسردگی میں شامل ہو جائے تو آدمی کے لیے سانس لینا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ ساقی فاروقی آہ پکار کے بجائے افسردگی کا محرک تلاش کرتے ہیں۔ جو انہیں کسی حد تک لمحۂ موجود کے صنعتی معاشرے کی پیداوار معلوم ہوتا ہے۔ اس صنعتی ترقی نے سوسائٹی میں محبت کا فقدان پیدا کر دیا ہے۔ اب آدمی کے پاس اپنے پیاروں سے ملنے اور محبت بانٹنے کا وقت بھی نہیں بچتا۔ یہ پیارے زندگی کے چراغ میں روشنی کا سامان کیا کرتے تھے۔ شاعر افسردگی کے عالم میں اپنوں سے ملنے کی خواہش کا اظہار کرتا ہے۔

طوافِ درد نہ کر آنسوؤں کے پاس نہ رہ
جواز ڈھونڈ بے *سبب اداس نہ رہ* (۸۱)

خاک اڑتی ہے محبت کے شبستانوں میں
شہر اپنی ہی طرح شام سے افسردہ ہے (۸۲)

مری حیات اک افسردہ رات جیسی ہے
ترے جمال کا معیار صبح کا دریا (۸۳)

آج ہم اداس ہیں اے نظر شناس آ

اور اس طرح سے پاس آ کہ فاصلہ رہے (۸۴)

منصور آفاق کی شاعری میں کوشش کے باوجود اداسی ختم ہونے کا نام نہیں لیتی۔ وہ اس افسردگی سے تنگ آ چکے ہیں جو برطانوی معاشرے کی دین ہے۔ یہ افسردگی ایک ایسا حصار بنانے میں کامیاب ہوگئی ہے جسے کسی بھی اسم سے توڑا نہیں جا سکتا۔ اس افسردگی کا شکار ہر دوسرا پاکستانی تارکین وطن ہو چکا ہے۔ شاعر کوشش کے باوجود جب شادمانی حاصل نہیں کر سکا تو اس کے پاس لعن تعن کے سوا کوئی چارہ نہیں بچا۔ اس کیفیت کے عالم میں ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ وہ ان سہاروں کو تلاش کرتا ہے جو اس کی غم گساری کو کم کر سکیں۔ یہ سہارے اس کے وہ دوست احباب ہیں جن کو مجبوریِ حالات میں وطن چھوڑ کر برطانیہ آنا پڑا تھا۔ ظاہر اس اداسی کا سبب کچھ بھی ہو اس کا حل تو وہی لوگ ہیں۔

کسی بھی اسم سے یہ ٹوٹتا نہیں منصور

فسردگی کے سلگتے ہوئے حصار پہ تف (۸۵)

ہم اداسی پہن کے پھرتے ہیں

کچھ ہماری بھی غم گساری دوست (۸۶)

علی ارمان کی اداسی میں خواہش کا پہلو خوابیدہ ہے۔ لفظ "رات" ظلم و ستم اور مایوسی کا استعارہ ہے۔ ظاہر ہے یہ مایوسی برطانوی معاشرے میں تارکینِ وطن کے مستقبل کے حوالے سے ہے۔ جبکہ لفظ "ستارے" روشنی کا استعارہ ہے۔ یہ استعارہ روشن خیال تارکینِ وطن کے لیے برتا گیا ہے۔ جو نئی نسل کے مستقبل کے حوالے سے فکر مند ہیں۔ اس نئی معاشرت میں پاکستانی تارکینِ وطن کی نئی نسل اپنی تہذیب و ثقافت، مذہب، زبان، اخلاقی اقدار سے کٹتے چلے جا رہے ہیں۔ یہ فکر ان تارکین وطن کو پریشان کیے ہوئے ہے۔ مذکورہ شعر میں لفظ "چاند" کا استعارہ روشن مستقبل کے لیے برتا گیا ہے۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستانی تارکینِ وطن اپنی نئی نسل کے لیے بہتر مستقبل کے خواہاں دکھائی دیتے ہیں۔

مرجھا چلے ہیں سارے ستارے اداس اداس

اب کہہ رہی ہے رات مجھے چاند چاہیے (۸۷)

۱۷۔ ستم رسیدگی:

تقسیم کے وقت ہونے والی نقل مکانی میں لوٹ گھسوٹ، قتل و غارت، چادر اور چار دیواری کا تقدس، اغوا برائے تاوان اور مذہبی انتہا پسندی جیسے پہاڑ توڑے گئے جس سے ایک نسل نفسیاتی حوالے سے ڈر اور خوف کے تسلط

میں رہی۔ اس ڈر اور خوف کے سائے اس وقت مزید گہرے ہوئے جب ہم وطنوں کو دوہری ہجرت کی اذیت سے گزرنا پڑا۔ ملکی حالات کے پیش نظر تارکین وطن کی ایک بڑی تعداد نے مغربی ممالک کو اپنا مسکن بنایا۔ وطن سے اس دوری نے ایک نئے کرب کو جنم دیا۔ دیارِ غیر میں تارکین وطن کو مختلف مسائل نے نبرد آزما ہونا پڑا۔ جن میں شناخت کا مسئلہ، شہریت کی فراہمی، بنیادی حقوق اور تلاش معاش نمایاں ہیں۔ ان کو حاصل کرنے کے لیے تارکین وطن کو ریاستی اور سماجی سطح پر ناروا سلوک کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تارکین وطن شعراء کی شاعری میں ستم رسیدگی اور ناروا سلوک کا اظہار جابجا ملتا ہے۔

تاریخ انسانی میں حق اور باطل کے درمیان جنگ رہی ہے۔ اس جنگ میں ہمیشہ طاقت ور اپنی دھونس جمانے کے لیے مظلوموں پر ظلم وبربریت کرتا آیا ہے۔ برصغیر میں نوآبادیاتی نظام میں اس کی کئی ایک مثالیں ملتی ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد بھی جاگیرداروں، وڈیروں، اور سرمایہ داروں نے اس رسم وریت کو جاری رکھا۔ سقوط ڈھاکہ بھی اس کی ایک مثال ہے۔ جس میں مظلوم بنگالیوں کا قتل عام کیا گیا۔ فوجی مارشل لاؤں نے بھی کوئی کسر نہ چھوڑی۔ دیار غیر میں یہ ظلم وستم ایک طرف تو سرمایہ دار طبقہ کر رہا ہے تو دوسری طرف تارکین وطن کے لیے ریاستی پالیسیوں نے ناک میں دم کیا ہوا ہے۔ احمد مشتاق کی شاعری میں محب اور محبوب کی علامتوں کے پس پشت اس ظلم وستم کی نشاندہی کی گئی ہے۔ ان کی شاعری میں مظلوم کی طرف سے لب کو سی لینے اور شکایت نہ کرنے کی ایک روایت ہے۔ اس ظالم کے ظلم سے ہر شے ملی دلی دکھائی دیتی ہے۔ رات بظاہر خود ایک تاریکی اور ظلم کی علامت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رات کا استعارہ احمد مشتاق کی شاعری میں ظلم وستم کا توانا استعارہ کے طور پر سامنا آتا ہے۔ دیار غیر میں ظلم وستم کے دنوں میں پچھلا پہر کا زرد چاند اور نرم ہوا گزرے ہوئے دنوں کی یاد تازہ کرتے ہیں۔

کچھ بھی نہ ستم گروں نے چھوڑا
ہر چیز ملی دلی پڑی ہے (۸۸)

ہر ظلم سہا جائے خاموش رہا جائے
کچھ بھی نہ کہا جائے یہ بھی تو الہنا ہے (۸۹)

پھر پچھلے پہر کی چاندنی میں
ہو جائیں گے کتنے درد بیدار (۹۰)
سلگ رہی ہے دلوں میں کسی کے درد کی آگ
یہ زرد چاند، یہ پچھلے پہر کی نرم ہوا (۹۱)

ساقی فاروقی کی شاعری میں "آنسو" کی علامت کے ذریعے دکھ درد کا اظہار ملتا ہے۔ یہ دکھ درد ان کے ہاں محبوب وطن میں گزرے تلخ ایام اور نئے بے حس معاشرے کی بے اعتنائی سے جنم لیتے ہیں۔ جس کی آگ میں ان کا سارا وجود خاکستر ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس حال میں وہ ستم گروں سے خواہش کا اظہار کرتے ہیں کہ ظلم و ستم کے پہاڑ جتنے ڈھا سکتے ہو ڈھالو۔ میں اس جنگ میں بھی سرخرو نکلوں گا۔ ان کی شاعری میں اس حوالے سے ایک امید دکھائی دیتی ہے کہ ایک نہ ایک دن یہ ظلم کے سائے چھٹیں گے۔

یہ کیسی بے حسی ہے کہ پتھر ہوئی ہے آنکھ
ویسے تو آنسوؤں کی کمک بار ہا ملی (۹۲)

یوں ہو گا کہ ان آنکھوں سے آنسو نہ بہیں گے
یہ چاند ستارے ٹھہر جائیں گے اک دن (۹۳)

موج کی طرح بہادر دکے دریاؤں میں
اس طرح زندہ بچا کون مگر جی نکلا (۹۴)

منصور آفاق کی شاعری میں ستم گر کا کردار ہنر مند دکھائی دیتا ہے جو نت نئے طریقوں سے ظلم ایجاد کرتا ہے۔ اگر اس ستم گر کے کردار پر روشنی ڈالی جائے تو یہ سرمایہ دار طبقہ ہے جو مختلف ادوار میں کبھی وڈیرہ تو کبھی جاگیر دار کا روپ دھارتا آیا ہے۔ ان لوگوں کے آگے سرمایہ حاصل کرنے کرنا اول ترجیحی ہوتا ہے جس میں انسانی جذبات و احساسات معنی نہیں رکھتے۔ بظاہر تو یہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے ہیں لیکن دوسرے طرف نگاہ ڈالی جائے تو یہ اخلاقی و روحانی سطح پر برباد ہوتے ہیں شاعر ستم گروں کو مشورہ دیتا ہے کہ اگر انسانیت کو ختم کرنا ہے تو اخلاقی و روحانی سطح پر تباہ و بربادی کو پھیلاؤ۔ برطانوی معاشرہ اب روحانی و اخلاقی حوالے سے ہی انسانی اقدر کی دھجیاں اڑا رہا ہے۔

اب کوئی ایسا ستم ایجاد کر
اس کو بھی اپنی طرح برباد کر
اک قیامت سے نکل آیا ہوں میں
اب کوئی نازل نئی افتاد کر (۹۵)

۱۸۔ تنہائی:

تنہائی تارکین وطن کا ایک اہم مسئلہ ہے۔ مغربی معاشرے جغرافیائی حوالے سے پاکستان سے کوسوں دور ہیں۔ جہاں اپنوں سے ملاقات سالہاسال تک ممکن نہیں ہو پاتی۔ دکھ سکھ کے موقعوں پر بھی بروقت پہنچ نہیں پاتے۔ تہواروں کے موقعے پر بھی رابطے کا کوئی خاص ذریعہ نہیں ہوتا۔ معاشی حالات کے پیشِ نظر تارکین وطن چھٹیوں کے موقعے پر چاہتے ہوئے بھی آبائی گھروں کو نہیں لوٹتے۔ مغربی معاشرہ مادیت پرست معاشرہ ہیں۔ جہاں انسانی جذبات و احساسات سے زیادہ دھن دولت کو اہمیت دی جاتی ہے۔ یہ معاشرہ انسانی قربتوں پر اثرانداز ہوتا ہے۔ مغرب کی صنعتی ترقی نے انسانی تعامل اورانسانی شناخت اس سے چھین کر اسے تنہا کر دیا ہے۔ جہاں کا ماحول تارکین وطن کے لیے ساز گار ثابت نہیں ہوتا۔ محبوب وطن سے اس دوری اور نئی طرز معاشرت میں اجنبیت کے احساس نے تارکین وطن کی تنہائی میں اضافہ کیا ہے۔

ڈاکٹر شیر علی رقمطراز ہیں:

> ”برطانوی معاشرے کا ایک بہت اہم رویہ اور رجحان بنیادی طور پر بیگانگی اور تنہائی کا رجحان ہے جس کی تشکیل میں بلاشک و شبہ بیرونی، سماجی، جغرافیائی اور معاشی عوامل نے ایک اہم کردار ادا کیا ہے لیکن اب یہ رجحان یہاں مقیم افراد کی فطرتِ ثانیہ بن گیا ہے۔ اسی رجحان کا شاخانہ ہے کہ موسم کی شدتیں انسانی رشتوں اور قربتوں پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ یہاں کے شعراء نے جغرافیائی پیچیدگیوں کو ذہنی اور نفسیاتی الجھنوں کے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے۔ اوریوں نئے تصورات کے ساتھ نئی لفظیات اور نئے لہجے کی تخلیق کا باعث بنے ہیں۔“(۹۲)

مغربی ممالک میں اجنبیت کا احساس جب گہرا ہوتا ہے تو تنہائی کا احساس آلیتا ہے۔ عموماً دن کے وقت لوگوں کی بھیڑ بھاڑ اور کام کاج میں وقت گزر جاتا ہے لیکن جوں ہی رات کے سائے لہلہانے لگتے ہیں تو تنہائی کی شدت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس تنہائی میں یادوں کی ایک دنیا آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتی ہے۔ جس میں اپنے پیاروں کے ساتھ ملاقات کے پھول کھلنے لگتے ہیں۔ لیکن تنہائی اس قدر شدید ہوتی ہے کہ اس میں فرصت ہی حاصل نہیں ہوتی جس سے یہ معلوم ہی نہیں ہو پاتا کہ کب یہ پھول کھلے اور مرجھا گئے۔ اس تنہائی کی گونج میں شاعر آواز لگانے کی خواہش کرتا ہے۔ اب تو اس موسم میں جینا اس کا معمول بن چکا ہے۔ اس لیے اپنوں سے جدائی پر وہ خفا نہیں ہوتا بلکہ ہنسی خوشی دن گزارنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی اسے تنہا ہونا برا لگتا ہے۔

کھل کے مرجھا بھی گئے فصلِ ملاقات کے پھول
ہم ہی فارغ نہ ہوئے موسمِ تنہائی سے (۹۷)

اس قدر گونج ہے اس رات کے سناٹے میں
نہ یقیں آئے تو آواز لگا کر دیکھو (۹۸)

تجھ سے دوری میں بھی خوش رہتا ہوں پہلے کی طرح
بس کسی وقت برا لگتا ہے تنہا ہونا (۹۹)

ساقی فاروقی کی شاعری میں مہاجرت کی زندگی میں پیدا ہونے والی تنہائی سے ہول آتا ہے۔ یہ وحشت نفسیاتی طور پر انسان کے حواس پر طاری ہوتی ہے۔جس میں انسان کے حواس خمسہ اس کے اختیار میں نہیں رہتے۔اس کے لاشعور میں ایسے مٹے ہوئے چہرے ابھرتے ہیں جن سے اس کو کبھی کسی نہ کسی صورت میں رغبت رہی۔وہ خواہش ظاہر کرتا ہے کہ ان بچھڑے ہوئے لوگوں کی قربت کے سائے میں دوبارہ بیٹھے۔ڈر اور خوف کے عالم میں بھی وہ اپنی خواہش کا اظہار کرنا چاہتا ہے لیکن سکتے کے عالم میں بدقسمت آوازاس کا ساتھ نہیں دے پاتی۔اس کیفیت میں دوسروں سے مدد طلب کرتا ہے کہ کوئی شخص تو انہیں پکارے۔

ساقی فاروقی کے حوالے ڈاکٹر شیر علی رقمطراز ہیں:

"ساقی فاروقی کے ہاں بھی مہاجرت اور مسافرت کا احساس ایک الم ناک احساس ہے۔دنیاوی آسائشوں کا حصول دراصل "سائے کے تعاقب" کی مانند ہے۔یہ احساس کہ "گھر" میں ازل سے اس کا انتظار کیا جارہا ہے لیکن "عمر بھر کا سفر" ان کے لیے ایک المیے اور حادثے کی صورت اختیار کر چکا ہے۔مہاجرت کا یہ احساس "اندھیروں پر مبنی تنہائی" کا روپ دھار لیتا ہے۔اس ہولناک تنہائی میں وہ سارے بچھڑے ہوئے لوگوں کو صدائیں دیتا نظر آتا ہے۔مہاجرت کے نفسیاتی زاویے ان کی غزل میں زیادہ شدت اور گہرائی سے واضح ہوئے ہیں۔" (۱۰۰)

شاعر وحشت اور جنون کے عالم میں کبھی کبھی برطانیہ کے ساحلِ سمندر میں پہنچ جاتا ہے۔یہ ساحل انسان کی تنہائی دور کرنے کے لیے تفریح کا سامان مہیا کرتا ہے۔جہاں دل بہلانے کے لیے بے شمار خوبصورت اور دلکش

لڑکیاں موجود ہوتی ہیں۔ جو برہنہ جسم سمندر کی موجوں سے اٹھکیلیاں کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ شاعر کی تنہائی اس کھیل تماشے کو دیکھنے کے بعد بھی کم نہیں ہوتی ۔ یہاں تک کہ ساحلِ سمندر ان دوشیزؤں سے خالی ہو جاتا ہے۔ آخر کار اس ساحل پر یا تو شاعر بچتا ہے یا اس کی طرح تنہا آسمان۔

وہ اندھیرا ہے کہ تنہائی سے ہول آتا ہے
سارے بچھڑے ہوئے لوگوں کو صدا دو کوئی (۱۰۱)

ایک میں ہوں ایک آسمان ہے
ساحلوں سے لڑکیاں چلی گئیں (۱۰۲)

صنعتی معاشرے نے دیہات کا کلچر ختم کر کے شہروں کو متعارف کروایا۔ شہر نے جہاں انسان کی زندگی کو سہل بنایا وہی مشکلات میں بھی اضافہ کیا۔ اس مصروف زندگی میں انسان نے مادی آسائشیں کے تعاقب میں خود کو مشین کے پرزوں کے روپ میں ڈھال لیا ہے۔ اک دوسرے سے ملنے ملانے کے لیے بھی وقت نہیں۔ اگر وقت بچے بھی تو حرص وہوس کے چکر میں اور ٹائم کی نذر کر دیا جاتا ہے۔ جس نے بری طرح تنہائی میں اضافہ کیا ہے۔ منصور آفاق کی شاعری میں شہری زندگی سے پیدا ہونے والی تنہائی کا احساس موجود ہے۔ جو اس قدر شدید ہے کہ زمان و مکاں کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہے۔

بڑی اداس بڑی بے قرار تنہائی
ذرا سے شہر میں ہے بے شمار تنہائی
مرے مزاج سے اس کا مزاج ملتا ہے
میں سوگوار تو ہے سوگوار تنہائی
یونہی یہ شہر میں کیا سائیں سائیں کرتی ہے
ذرا سے دھیمے سروں میں پکار تنہائی
نہ کوئی نام نہ چہرہ نہ رابطہ نہ فراق
کسی کا پھر بھی مجھے انتظار، تنہائی
مری طرح کوئی تنہا ادھر بھی رہتا ہے
بڑی جمیل ،افق کے بھی پار تنہائی (۱۰۳)

دسمبر کا مہینہ ہجر کا استعارہ، اداسی کی علامت اور یادوں کا مسکن ہے۔اس موسم میں کسی بھی چیز میں زندگی کی رمق دکھائی نہیں دیتی۔شعراء اس مہینہ میں حد سے بھر کر اداس ہوتے ہیں۔یہ موسم پاکستان میں جان لیوا حد تک خطرناک ہوتا ہے تو برطانیہ جیسے ملک میں تو موت کا سبب بنتا ہو گا۔جہاں اس موسم میں شہر اور وادیوں نے برف کی پوشاک اوڑھی ہوتی ہے۔علی ارمان کی شاعری میں اس موسم میں اپنوں کے فراق کا دکھ ملتا ہے۔جو ان برفیلی وادیوں میں تنہا بارہ دسمبر بیتا چکے ہیں۔اس تنہائی کے عالم میں انہیں اپریل اب تک نہیں بھولا۔عموماً اپریل کا مہینہ پاکستان میں بہار کا مہینہ ہوتا ہے۔اس موسم میں ہر طرف زندگی نظر آتی ہے۔سرسبز و شاداب مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں۔اور کوئل کی کوک کانوں میں رس گھولتی ہوئی ملتی ہے۔

اپریل کی وہ دھوپ نہیں بھولتی مجھے

بارہ برس سے میرا دسمبر اداس ہے [۱۰۴]

حوالہ جات

۱۔ جواز جعفری، ڈاکٹر، اردو ادب یورپ اور امریکہ میں، مکتبہ عالیہ، لاہور، ص۳۸۱، ۲۰۱۰ء

۲۔ شیر علی، ڈاکٹر، برطانیہ میں اردو شاعری کی روایت، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ص۵۰۵، ۲۰۲۲ء

۳۔ ایضاً، ص۱۸

۴۔ مشتاق احمد، مرتبہ، آدمی ہمارا (شعریات احمد مشتاق)، پیس پبلی کیشنز، ص۲۰۹، ۲۰۱۹ء

۵۔ احمد مشتاق، مجموعہ: احمد مشتاق، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ص۲۰۰، ۲۰۲۱ء

۶۔ نبی احمد، مقالہ نگار، اردو غزل میں ہجرت کا تجربہ، وفاقی اردو یونیورسٹی برائے فنون، سائنس اور ٹیکنالوجی، اسلام آباد، مقالہ برائے پی ایچ ڈی، س ن

۷۔ احمد مشتاق، مجموعہ: احمد مشتاق، ص۱۹۷

۸۔ ساقی فاروقی، سرخ گلاب اور بدمنیر (تمام نظمیں، تمام غزلیں)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵، ۱۲۴ء

۹۔ منصور آفاق، دیوانِ منصور آفاق، وراق مرکز، لاہور، ص ۲۰۱۴، ۲۳۱ء

۱۰۔ علی ارمان، مجھے چاند چاہیے، خزینہ ادب اردو، لاہور، ص۱۹۵تا۱۹۶، ۲۰۰۰ء

۱۱۔ احمد مشتاق، مجموعہ: احمد مشتاق، ص۳۶۷

۱۲۔ ساقی فاروقی، سرخ گلاب اور بدمنیر (تمام نظمیں، تمام غزلیں)، ص۲۰۰۵، ۲۲۸ء

۱۳۔ ایضاً، ص۲۱۹

۱۴۔ منصور آفاق، دیوانِ منصور آفاق، ص ۲۰۳ء

۱۵۔ ایضاً، ص۲۳۱

۱۶۔ احمد مشتاق، مجموعہ: احمد مشتاق، ص۳۶۱

۱۷۔ مشتاق احمد، مرتبہ، آدمی ہمارا (شعریاتِ احمد مشتاق)، ص۲۹

۱۸۔ احمد مشتاق، مجموعہ: احمد مشتاق، ص۲۹

۱۹۔ ساقی فاروقی، سرخ گلاب اور بدر منیر (تمام نظمیں، تمام غزلیں)، ص۲۶۹

۲۰۔ منصور آفاق، دیوانِ منصور آفاق، ص۴۹

۲۱۔ خوشحال زیدی، ڈاکٹر، اردو کی درسی کتب میں حب الوطنی، کلر پریس، دہلی، ص۱۷۱، س ن

۲۲۔ احمد مشتاق، مجموعہ: احمد مشتاق، ص۱۱۲

۲۳۔ساقی فاروقی، سرخ گلاب اور بدر منیر (تمام نظمیں، تمام غزلیں)، ص۲۶۹

۲۴۔ منصور آفاق، دیوانِ منصور آفاق، ص۱۹۰

۲۵۔شیر علی، ڈاکٹر، برطانیہ میں اردو شاعری کی روایت (آغاز تا عصرِ حاضر)، ص۵۱۹

۲۶۔احمد مشتاق، مجموعہ: احمد مشتاق، ص۱۱۶

۲۷۔ایضاً، ص۱۸۴

۲۸۔ایضاً، ص۳۷۸

۲۹۔ساقی فاروقی، سرخ گلاب اور بدر منیر (تمام نظمیں، تمام غزلیں)، ص۲۵۹

۳۰۔منصور آفاق، دیوانِ منصور آفاق، ص۱۳۳

۳۱۔ایضاً، ص۲۰۴

۳۲۔ایضاً، ص۱۵۳

۳۳۔ایضاً، ص۱۹۰

۳۴۔ایضاً، ص۲۰۹

۳۵۔ایضاً، ص۲۱۰

۳۶۔ایضاً، ص۲۴۱

۳۷۔ایضاً، ص۱۹۸

۳۸۔ایضاً، ص۲۴۱

۳۹۔احمد مشتاق، مجموعہ: احمد مشتاق، ص۴۲

۴۰۔ساقی فاروقی، سرخ گلاب اور بدرِ منیر، ص۳۰تا۳۱

۴۱۔ساقی فاروقی، سرخ گلاب اور بدر منیر (تمام نظمیں، تمام غزلیں)، ص۲۱۱

۴۲۔منصور آفاق، دیوانِ منصور آفاق، ص۱۳۴

۴۳۔ایضاً، ص ۵۴

۴۴۔احمد مشتاق، مجموعہ: احمد مشتاق، ص۱۶۱

۴۵۔ایضاً، ص۱۶۳

۴۶۔احمد مشتاق، مرتبہ، آدمی ہمارا (شعریاتِ احمد مشتاق)، پیس پبلی کیشنز، ص۱۳۹

۴۷۔احمد مشتاق، مجموعہ: احمد مشتاق، ص۱۸۳

۴۸۔ ساقی فاروقی، سرخ گلاب اور بدر منیر (تمام نظمیں، تمام غزلیں)، ص ۲۴۰
۴۹۔ ایضاً ، ص ۲۴۱
۵۰۔ ایضاً، ص ۲۳۱
۵۱۔ منصور آفاق، دیوانِ منصور آفاق، ص ۳۳۱
۵۲۔ ساقی فاروقی، زندہ پانی سچاپانی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ص ۱۹۷
۵۳۔ ایضاً، ص ۲۱۲
۵۴۔ ساقی فاروقی، سرخ گلاب اور بدر منیر (تمام نظمیں، تمام غزلیں)، ص ۳۱۸
۵۵۔ احمد مشتاق، مجموعہ: احمد مشتاق، ص ۸۵
۵۶۔ ایضاً، ص ۱۶۹
۵۷۔ ایضاً، ص ۲۴۹
۵۸۔ علی ارمان، مجھے چاند چاہیے، ص ۸۲
۵۹۔ اردو نظم میں مناظر فطرت، ڈاکٹر صبیحہ ناہید، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی، ص ۱۹ تا ۲۰، ۲۰۱۹ء
۶۰۔ شیر علی، ڈاکٹر، برطانیہ میں اردو شاعری کی روایت (آغاز تا عصر حاضر)، ص ۵۱۲
۶۱۔ احمد مشتاق، مجموعہ: احمد مشتاق، ص ۳۰ تا ۳۱
۶۲۔ ساقی فاروقی، سرخ گلاب اور بدر منیر (تمام نظمیں، تمام غزلیں)، ص ۲۵۲
۶۳۔ منصور آفاق، دیوانِ منصور آفاق، ص ۸۹
۶۴۔ علی ارمان، مجھے چاند چاہیے، ص ۱۹۵
۶۵۔ شیر علی، ڈاکٹر، برطانیہ میں اردو شاعری کی روایت (آغاز تا عصرِ حاضر)، ص ۵۰۷
۶۶۔ احمد مشتاق، مجموعہ: احمد مشتاق، ص ۱۷۸
۶۷۔ منصور آفاق، دیوانِ منصور آفاق، ص ۱۸۴
۶۸۔ احمد مشتاق، مجموعہ: احمد مشتاق، ص ۱۹۳
۶۹۔ ساقی فاروقی، سرخ گلاب اور بدر منیر (تمام نظمیں، تمام غزلیں)، ص ۲۱۷
۷۰۔ ایضاً، ص ۲۰۹
۷۱۔ منصور آفاق، دیوانِ منصور آفاق، ص ۶۷
۷۲۔ احمد مشتاق، مجموعہ: احمد مشتاق، ص ۹۹

۷۳۔ساقی فاروقی، سرخ گلاب اور بدر منیر (تمام نظمیں، تمام غزلیں)، ص ۲۲۲

۷۴۔منصور آفاق، دیوانِ منصور آفاق، ص ۱۹۰

۷۵۔ایضاً، ص ۲۶۱

۷۶۔احمد مشتاق، مجموعہ: احمد مشتاق، ص ۳۵۸

۷۷۔ایضاً، ص ۳۷۳

۷۸۔ایضاً، ص ۳۵۷

۷۹۔ایضاً، ص ۳۵۴

۸۰۔ایضاً، ص ۲۳

۸۱۔ساقی فاروقی، سرخ گلاب اور بدر منیر (تمام نظمیں، تمام غزلیں)، ص ۲۹۲

۸۲۔ایضاً، ص ۲۵۳

۸۳۔ایضاً، ص ۲۶۳

۸۴۔ایضاً، ص ۲۸۸

۸۵۔منصور آفاق، دیوانِ منصور آفاق، ص ۱۱۱

۸۶۔ایضاً، ص ۶۳

۸۷۔علی ارمان، مجھے چاند چاہیے، ص ۲۵

۸۸۔احمد مشتاق، مجموعہ: احمد مشتاق، ص ۴۰۷

۸۹۔ایضاً، ص ۵۷

۹۰۔ایضاً، ص ۹۵

۹۱۔ایضاً، ص ۳۷

۹۲۔ساقی فاروقی، سرخ گلاب اور بدر منیر (تمام نظمیں، تمام غزلیں)، ص ۲۳۵

۹۳۔ایضاً، ص ۲۱۷

۹۴۔ایضاً، ص ۲۰۷

۹۵۔منصور آفاق، دیوانِ منصور آفاق، ص ۸۱

۹۶۔ڈاکٹر شیر علی، برطانیہ میں اردو شاعری کی روایت (آغاز تا عصرِ حاضر)، ص ۵۰۷

۹۷۔احمد مشتاق، مجموعہ: احمد مشتاق، ص ۱۹۵

۹۸۔ ایضاً، ص ۲۷۱

۹۹۔ ایضاً، ص ۷ ۱۴

۱۰۰۔ شیر علی، ڈاکٹر، برطانیہ میں اردو شاعری کی روایت (آغاز تا عصرِ حاضر)، ص ۵۰۳

۱۰۱۔ ساقی فاروقی، سرخ گلاب اور بدر منیر (تمام نظمیں، تمام غزلیں)، ص ۲۲۴

۱۰۲۔ ایضاً، ص ۲۷۲

۱۰۳۔ منصور آفاق، دیوانِ منصور آفاق، ص ۲۰۷ تا ۲۰۸

۱۰۴۔ https://www.facebook.com/share/p/7tjPYahG68ENA9py/?milbextid=oFDknk

باب چہارم:

ماحصل

الف۔ مجموعی جائزہ:

زمانہ مختلف ادوار پر مشتمل ہے۔ جن میں ماضی، حال اور مستقبل شامل ہیں۔ ہر لمحہ تغیر پذیر ہے۔ اس لیے ہر گزرتا لمحہ ماضی کا حصہ بنتا ہے۔ انسانی فطرت میں ہے کہ وہ ہمیشہ ماضی کو حال سے بہتر قرار دیتا ہے۔ عموماً انسان ماضی کی سمت اس وقت رخ کرتا ہے جب وہ حال کے سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی حالات و واقعات سے بیزار ہو۔ حال سے یہ فراریت اسے ماضی میں پناہ فراہم کرتی ہے۔ جو اس کے قلب و روح کو راحت و سکون پہنچاتی ہے۔ ماضی دو طرح کی یادوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ جن میں خوشگوار اور ناخوشگوار یادیں شامل ہیں۔ مثبت قوت کی بنیاد پر حاصل ہونے والا راحت و سکون حال کی از سر نو تشکیل کرتا ہے جبکہ روشن مستقبل کے لیے بنیادیں بھی فراہم کرتا ہے۔ ادب معاشرے کا آئینہ ہوتا ہے جو تہذیبی و ثقافتی حسیات کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ معاشرے میں پیدا ہونے والے مختلف رویوں، رجحانات، تحریکات اور عوامل کو مخصوص انداز میں پیش کرتا ہے۔ ادبا و شعراء کا معاشرے کے حساس طبقے سے تعلق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سماجی سطح پر پیدا ہونے والے کرب و جوار کو شدت کے ساتھ نہ صرف محسوس کرتے ہیں بلکہ اظہار میں بھی لاتے ہیں۔

بیسویں صدی میں برصغیر میں سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی اور جغرافیائی تبدیلیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ جس کی جھلک اردو شاعری میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اس دور میں یہ براعظم تقسیم کے عمل سے گزرا۔ جس کی بنیاد نظریے پر رکھی گئی، لیکن درحقیقت اس تقسیم کے پس پشت جغرافیائی عوامل شامل تھے۔ تقسیم ہند کے نتیجے میں معاشرتی سطح پر نئی نئی تبدیلیاں دیکھنے کو ملی۔ جس سے سماجی سطح پر ایک نئے کرب نے جنم لیا۔ جس سے انسان داخلی سطح پر شکست و ریخت محسوس کرنے لگا۔ اس نئے کرب نے اسے تشخص کی راہ پر گامزن کیا۔ قیام پاکستان کے بعد اردو ادب میں موضوعاتی سطح پر تنوع دیکھا گیا ہے۔ جس میں حب الوطنی، قوم پرستی اور معاشرتی اصلاح شامل ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک اور اہم رجحان بھی دیکھنے کو ملا ہے جو ناسٹلجیا کی شکل میں تھا۔ جس کی بنیاد ہجرت کے تجربے پر رکھی گئی۔ ناسٹلجیا کی اصطلاح کا تعلق علم نفسیات سے ہے۔ یہ ایک ایسا رجحان ہے جو ماضی کے شدید احساس سے جنم لیتا ہے۔ اس اصطلاح کو سب سے پہلے یونس ہافر نے ۱۶۶۸ء میں "دیس ہڑکا" کے معنوں میں استعمال

کیا۔ جنگِ عظیم اول اور دوم میں اسے ایک بیماری کے طور پر دیکھا جا تا رہا ہے۔ جو عموماً ان جنگی سپاہیوں میں پائی جاتی تھی جو ایک عرصے سے حالتِ جنگ میں اور مسافرت میں تھے۔ یہ بیماری تکلیف، پریشانی اور بخار کی صورت میں محسوس کی گئی۔ جس نے ان سپاہی کو دل برداشتہ کیا اوران کے اندر مراجعت کی خواہش کو بیدار کیا۔ ادب میں ناسٹلجیا لمحہِ موجود میں ماضی کو دریافت کرنے کا عمل ہے۔ جو حال سے بیزاری کے سبب پیدا ہوتا ہے۔ ناسٹلجیا کے سماج پر مثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ جو سماجی مصروفیات کو فعال بنا کر اپنائیت کے جذبات کو فروغ دیتا ہے اور سماجی صلاحیتوں پر اعتماد بڑھاتا ہے۔ جس سے نئے تعلقات تلاش کرنے، حوصلہ افزائی اور موجودہ تعلقات میں پیدا ہونے والے مسائل پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ اس سے ہمدردی اور دوسروں کی مدد کرنے جیسے جذبات بھی پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ناسٹلجیا مشترکہ انسانیت اور ہمدرد معاشرے کے قیام میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

شاعری جذبات واحساسات کا اظہار ہوتی ہے۔ جس کا تعلق داخلی سچائی سے ہوتا ہے۔ داخلی سطح پر ہونے والی مختلف محسوسات کو قوت گویائی سے موزوں بنایا جاتا ہے۔ انسان اور حیوان میں قوت گویائی کا فرق ہے۔ حیوان اپنے جذبات و احساسات کا اظہار حرکات و سکنات جبکہ انسان قوت گویائی سے کرتا ہے۔ شعراء اسی معاشرے کا حصہ ہوتے ہیں لہٰذا وہ ماحول اور سماج کا گہرا اثر قبول کرتے ہیں۔ اردو شاعری اپنے اندر ہندوستانی تہذیب وثقافت، سیاسی وسماجی حالات وواقعات اور مختلف رجحانات ومیلانات اور تحریکات کو سموئے ہوئے ہے۔ ان رجحانات میں ایک رجحان ناسٹلجیا کا ہے۔ جو آغاز سے اردو شاعری میں کسی نہ کسی صورت میں رہا ہے۔ طبعی کی شاعری میں اپنے شہر سے محبت جبکہ سراج اورنگ آبادی، اشرف اور ولی دکنی کی شاعری میں ماضی کی یادیں اور غریب الوطنی میں وطن سے محبت کے جذبات ملتے ہیں۔ اس کے بعد کے شعراء میں میر تقی میر، مرزا محمد رفیع سودا، خواجہ میر درد، ابراہیم ذوق، مرزا اسد اللہ خان غالب اور مومن خان مومن کی شاعری میں ہجرت کا کرب، غریب الوطنی، حب الوطنی، حزن وملال، دنیا کی بے ثباتی اور مراجعت کی خواہش کے جذبات ملتے ہیں۔ اس کے بعد کی کھیپ میں داغ دہلوی، امیر مینائی، اختر مینائی اور جلیل حسن کے ہاں غریب الوطنی میں وطن کی یاد اور خوشگوار لمحات کی حسین یادیں جابجا ملتی ہیں۔ ستاون کی جنگ آزادی کے بعد آزاد، حالی، مرزا راشد گورگانی، میر ناظم حسین ناظم، سبق الحق ادیب، راج نرئن ارمان اور مرزا اشرف بیگ کی شاعری میں حب الوطنی، مراجعت کی خواہش، فطرت نگاری اور یاد ماضی کی صورت میں ناسٹلجیا جلوہ گر ہوتا ہے۔ قیام پاکستان سے قبل میراں جی، ن۔م۔راشد، یوسف ظفر، مختار صدیقی، ضیا جالندھری، انجم رومانی اور حفیظ ہوشیارپوری کی شاعری تشخص کی متلاشی دکھائی دیتی ہے۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد ناصر کاظمی حفیظ جالندھری، جگن ناتھ آزاد، حبیب جالب، منیر نیازی، محسن بھوپالی، مصطفی

زیدی اورانجم رومانی کی شاعری میں ،شناخت کا مسئلہ ،رہبروں کا لٹ مار، آبائی وطن کی یاد ،اداسی ،ہجرت کا کرب اور یادِ ماضی کی صورت میں ناسٹلجیا ملتا ہے۔

تارکینِ وطن کی اصطلاح تارک اور وطن سے مل کر بنی ہے جبکہ تارکین تارک کی جمع ہے۔ یہ اصطلاح اپنے وطن سے دوسرے وطن ہجرت کر کے جا بسنے والے لوگوں کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ ہجرت دو طرح کی ہوتی ہے ایک تو اختیاری جو انفرادی طور پر خواہشات کی تکمیل اور بہتر معیار زندگی کی غرض سے کی جاتی ہے جبکہ دوسری ہجرت گروہ یا قوم کی صورت میں کسی ملک کے سیاسی، معاشی، معاشرتی، تہذیبی، مذہبی جبر اور تشدد کی وجہ سے کسی دوسرے ملک کی سمت کی جاتی ہے۔ دوسری قسم کی ہجرت کی مثال برصغیر میں قیامِ پاکستان کے وقت دیکھنے کو ملتی ہے۔ ہجرت ایک فطری عمل ہے۔ جو انسانی تاریخ کے ساتھ ساتھ سفر کرتی آئی ہے۔ کائنات کی کسی شے کا بھی غائر مشاہدہ اور مطالعہ کیا جائے تو یہ معلوم پڑتا ہے کہ ہر شے مسلسل سفر میں ہے اور تغیر اور ارتقاء سے گزر رہی ہے۔ آدم کی باغِ ادن سے لے کر محمد ﷺ کی مدینہ کی سمت ہجرت اسی سفر ایک کڑی ہے۔ انبیاء کے بعد بھی ہجرتوں کا ایک طویل سلسلہ رہا ہے جو اب تک جاری و ساری ہے۔ اللہ تعالی بھی ہجرت کو پسند فرماتا ہے۔ ان تمام ہجرتوں کے پسِ پشت کچھ نہ کچھ محرکات کارفرما رہے ہیں۔

اردو ادب کی بات کی جائے تو اس میں پانچ ہجرتیں دکھائی دیتی ہیں۔ ان ہجرتوں میں پہلی ہجرت اورنگ زیب عالم گیر کے دور میں فتح دکن کے نتیجے میں ہوئی جب شعراء نے دہلی کا رخ کیا۔ دوسری ہجرت احمد شاہ ابدالی اور نادر شاہ دورانی کے حملوں کے نتیجے میں ہوئی۔ جس میں شعراء نے لکھنو کو اپنا مسکن بنایا۔ تیسری ہجرت ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے نتیجے میں ہوئی جب شعراء نے لاہور میں سکونت اختیار کی۔ چوتھی ہجرت تقسیم ہند کے نتیجے میں عمل میں آئی جس میں شعراء نے پاکستان کا رخ کیا جبکہ پانچواں ہجرت قیامِ پاکستان کے بعد ساٹھ کی دہائی میں دیکھنے کو ملی جو اب تک جاری ہے۔ اس ہجرت میں شعراء نے خلیجی ریاستوں سمیت مغربی ممالک بالخصوص برطانیہ کا رخ کیا۔ ان ہجرتوں میں پہلی چار ہجرتیں سیاسی، معاشی، معاشرتی، تہذیبی، مذہبی جبر اور تشدد کی وجہ سے اجتماعی طور پر ہوئیں۔ جبکہ پانچواں ہجرت اختیاری ہونے کے ساتھ ساتھ انفرادی طور پر خواہشات کی تکمیل اور بہتر معیارِ زندگی کے لیے کی گئی۔

قیام پاکستان کے بعد ملکی سیاسی و معاشی حالات دن بہ دن پستی کی سمت سفر کرنے لگے۔ جنرل ایوب خان سے لے کر جنرل مشرف تک چار فوجی امروں کے فوجی مارشل لاء، سول حکمتوں کا ٹوٹنا اور بننا، ۱۹۶۵ء کی جنگ ،

۱۹۷۱ء میں سقوط ڈھاکہ، ۱۹۸۰ء میں سویت یونین کا ٹوٹنا، غیر ملکیوں کی مدد اور فوجی اڈوں کی فراہمی، عالمی سطح پر ۹/۱۱ کا واقعہ جیسے محرکات نے بھی ملک میں افرتفری، دہشتگردی، فرقہ وریت، عدم تحفظ، سیاسی عدم استحکام، آئے دن بڑھتی ہوئی مہنگائی اور بیروزگاری جیسے بحران کو جنم دیا۔ ان حالات کے پیشِ نظر تارکینِ وطن میں ترقی یافتہ ممالک بالخصوص برطانیہ کی سمت ہجرت میں آئے دن اضافہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ تارکین وطن کی ہجرت کے محرکات کے بارے ڈاکٹر شیر علی رقمطراز ہیں:

> ”برصغیر پاک وہند کے باشدوں نے پچھلی چند صدیوں میں برطانیہ کا سفر اختیار کیا۔ اس سفر اور وہاں پر مختصر یا مستقل قیام کی کئی وجوہات ہیں۔ تعلیمی، سیاسی، سماجی، ثقافتی اور تہذیبی وجوہات کے علاوہ غالباسب اہم وجہ معاشی آسودگی ہے۔“

برطانیہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں ہجرت کے بعد تارکینِ وطن کو وہاں کی نئی معاشرت میں کئی ایک مسائل کا سامنا ہے۔ ان مسائل میں شہریت، نئی تہذیب وثقافت میں کھلناملنا، رابطے کے لیے زبان سے ناواقفیت، مذہبی عبادات ورسومات میں آزادی، سماجی اور اخلاقی اقدار کا ڈر شامل ہے۔ ایسے حالات میں برطانوی شعراء کی شاعری میں ناسٹلجیا کا رحجان نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ یہ شعراء تخلیقی سطح پر پاکستانی تہذیب وثقافت اور معاشرت کے ساتھ جڑے ہوئے دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان میں احمد مشتاق، ساقی فاروقی، منصور آفاق اور علی ارمان کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

احمد مشتاق کی شاعری میں مغربی معاشرے میں وقت کی کمی کا شدت کے ساتھ احساس پایا جاتا ہے جس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی خوشگوار یادوں میں آبائی وطن بالخصوص لاہوراورامرتسر کے گلی کوچوں کی یادیں، دوست واحباب کے ساتھ گزرے لمحے، عہد طفلی کی حسین یادیں، لڑکپن کی شوخی شرارت، جوانی کے ایام اور عہد رفتگاں کے مٹتے نقوش شامل ہیں۔ دوہری ہجرت کے کرب نے ان کے باطن میں داخلی سطح پر انہدام پیدا کر کے ایک نئے المیے کو جنم دیا ہے جو ان کے ہمعصروں کے ہاں کم کم دکھائی دیتا ہے۔ اس کرب نے ان کی شاعری میں افسردگی اور مایوسی کے سایوں کو مزید گہرا کیا ہے۔ اس نئے سماج نے انہیں اس قدر تنہا کر دیا ہے کہ وہ ماضی میں تشخص کے متلاشی دکھائی دیتے ہیں۔ یہ تلاش مکمل نہیں ہونے پاتی جس میں اب تک تشنہ لبی باقی ہے، بالخصوص نئی نسل کی شناخت اور مستقبل کے حوالے سے پریشانی کا ایک عالم موجود ہے۔ جو ایک طرح کی غمگیر اور تشویش ناک صورت حال ہے۔ ان کی شاعری میں مغرب کی چکاچوند معاشرت اور بہترین معاشی انفرسٹکچر میں صورت حالات نہ بدلنے کا دکھ بھی اپنی جگہ جوں کا توں موجود ہے۔ اس مادیت پرست معاشرے میں اخلاقیات کی دھجیاں اڑاتی ہوئی دیکھ کر

انہیں پاکستانی تہذیب و ثقافت اور اقدار شدت سے یاد آتی ہیں۔ وقت کے لامتناہی جبر و استبداد کی وجہ سے انسانی رشتوں کا انہدام ان کی شاعری میں مختلف استعاروں کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ اس بے رحمی نے نہ صرف ان سے گوہرِ نایاب دوست احباب چھینے ہیں بلکہ ایک پوری تہذیب کو مٹا کرر کھ دیا جس کی خاک وہ ماضی میں کریدتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی شاعری میں مغربی معاشرے سے اکتاہٹ کا عنصر غالب دکھائی دیتا ہے۔

احمد مشتاق کی شاعری میں ملک پلٹنے کی خواہش سر اٹھاتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن یہ خواہش جلد ہی ایک ایسی ناکام تمنا میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ جو کبھی پوری نہیں ہوتی۔ جو شدید قسم کی مایوسی کا سبب بنتی ہے۔ اس مایوسی اور جذبات و احساسات کے قتل نے ان کے لاشعور میں رائیگانی اور لاحاصلی کے گہرے احساس کو پیدا کر دیا ہے۔ اس نئے ماحول میں حکومتی پالیسیوں اور مقامی لوگوں کے ناروا سلوک نے ان کی شاعری میں قومیت کے تصور کو بھی ہوا دی ہے۔ جس میں وہ پاکستانی ہونے پر فخر محسوس کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جو ایک طرح سے ان کی شاعری میں حب الوطنی کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ ملکی حالات پر کراہتے ہیں اور ملک سے ناراضگی کا اظہار بھی کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی شاعری محب اور محبوب کے کردار کے ذریعے مشرقی اور مغربی تہذیبوں میں واضح فرق کرتی ہوئی ملتی ہے جو ناسٹلجیا کی صورت ظاہر ہوتا ہے۔ وہ کہیں کہیں اس تہذیب و ثقافت سے متاثر بھی دکھائی دیتے ہیں لیکن یہ رویہ ان کی شاعری میں دیگر شعراء سے کم کم دکھائی دیتا ہے۔ اس کے علاوہ قدیم آبائی وطن، اس کے شہروں، بستیوں اور ان بستیوں کی کچی پکی گلیوں، اونچے نیچے مکانات، وہاں کے موسموں کا تغیر اور تہذیب و ثقافت کا اظہار جابجا ملتا ہے۔ احمد مشتاق ماضی کی یادوں اور اس کی تمام تر کیفیات میں گم اس زمانے کو تلاشنے کی سعی کرتے ہیں۔ جہاں ان کے خوشگوار دن اور خوشگوار تعلقات اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمکتے دمکتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس تلاش کے بعد وہ اس زمانے کو حال میں بھی دیکھنے کے متمنی ہیں۔ ان کی شاعری میں مغربی مصنوعی ماحول میں آبائی وطن کے قدرتی مناظر کی جھلک بھی ملتی ہے۔

ہجرت کے باوجود ساقی فاروقی کی شاعری مغربی درہم و دینار پرست ماحول میں اپنے ادب، کلچر سے مضبوط رشتہ قائم کیے ہوئے ہے۔ یہ رشتہ ناسٹلجیا کی صورت میں ان کی شاعری میں وقوع پذیر ہوتا ہے۔ ہجرت کے کرب نے ان کے ہاں رشتوں میں بے اعتباری کو جنم دیا ہے۔ ایسے میں تنہائی نے ان کے گھر کا رستہ ڈھونڈ نکالا ہے۔ اس تنہائی میں وہ تشخص کی تلاش میں بھٹکتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی شاعری میں تشخص کا عنصر نمایاں ملتا ہے۔ جو مذہبی اخلاقیات، معاشرتی معیارات اور اصول و ضوابط سب کو روندتا ہوا گزر جاتا ہے۔ اس معاملے میں ساقی فاروقی

کی شاعری احمد مشتاق سے مختلف دکھائی دیتی ہے۔ مسافرت میں درپیش دشواریوں کی المناک داستان اور حالات وواقعات کی تلخیوں میں حالات نہ سنوارنے کا دکھ دیگر شعراء کی طرح ان کے ہاں بھی ملتا ہے۔ ساقی فاروقی پاکستانی سیاسی و معاشی حالات پر کراہتے ہوئے ہوئی دکھائی دیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کے ہاں ایک نفسیاتی کشمکش کی صورت حال موجود ہے جو ڈر و خوف کی پیداوار ہے۔ اس حوالے سے ان کی شاعری میں مایوسی کے باوجود امید کا پہلو دکھائی دیتا ہے۔ مغربی تہذیب نے مادے کی دوڑ میں انسان کو انسان سے دور کر دیا ہے جس نے جائز اور ناجائز کے درمیان تمیز کو ختم کر دیا ہے۔ ساقی فاروقی اس ماحول میں مشرقی تہذیب کو یاد کرتے ہیں جہاں انسانیت کی اعلیٰ قدریں اب بھی موجود ہے۔ اس ماحول سے اکتاہٹ دیگر ہمعصروں کی طرح ان کی شاعری میں بھی موجود ہے۔

ساقی فاروقی کی شاعری میں پاکستان سے ذہنی و جذباتی وابستگی کے باوجود ملک پلٹنے کا کوئی پہلو دکھائی نہیں دیتا۔ احمد مشتاق کی طرح ان کی شاعری میں بھی دوہری ہجرت رائیگانی کا سفر معلوم ہوتی ہے۔ جس نے انہیں شدید طرح سے کاروبارِ دنیا سے بیزار کر دیا ہے۔ یہ رائیگانی اپنے وسیع معنوں میں ان شعراء کی شاعری میں دنیا کے سفر کو بھی رائیگاں قرار دیتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ معاشی ناآسودگی اور حالات واقعات کی تلخیوں کے باوجود ساقی فاروقی جیسا بے باک شاعر کے ہاں پاکستانیت کا عنصر غالب دکھائی دیتا ہے جو ایک طرح کا مغربی ماحول میں تشخص کے مسائل کی پیداوار معلوم ہوتا ہے۔ ان کے ہاں ملکی حالات کے پیش نظر ایک انقلابی سوچ بھی ملتی ہے لیکن یہ سوچ قنوطیت کی شکار دکھائی دیتی ہے۔ ساقی فاروقی کی شاعری میں ان پاکستانی تارکینِ وطن کی عکاسی بھی ملتی ہے جو نئے معاشرت میں اپنی تہذیبی پس منظر کو پس پشت ڈال کر حرص وہوس کے پوجاری بن چکے ہیں۔ آبائی زمینوں کی یادیں بالخصوص کراچی شہر اور اس کی طرف مراجعت کی خواہش ان کی شاعری میں موجود ہے۔ مغربی ماحول سے اجنبیت کے نتیجے میں وہ ماضی میں ان رشتوں کو تلاشنے اور دوبارہ ان کے قرب میں دن گزارنے کے خواہاں بھی دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی شاعری میں جمہوری قدروں اور نام نہاد آزادیوں پر گہرا طنز ملتا ہے۔ ان معاشروں میں جمہوریت کے نام پر انسان کے ساتھ ہونے والے ناروا سلوک پر احتجاج کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ معاشرے میں حقیقی آزادی اور برابری کا نظام دیکھنا چاہتا ہے۔ یہ نظام انہیں کسی حد تک مشرقی تہذیب میں دکھائی دیتا ہے۔ تارکینِ وطن کو برطانوی شہریت حاصل کرنے میں جن مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ان مسائل کا اظہار ساقی کی شاعری میں ملتا ہے۔ ان کے ہاں آبائی وطن کے قدرتی مناظر کا حچب بھی دکھائی دیتی ہے۔ غریب الوطنی کی زندگی میں درپیش مصائب الم کا اظہار ایک ایسا عنصر ہے جو ان کے ہاں دیگر عناصر سے زیادہ دکھائی دیتا ہے۔ اس ماحول نے ان کے اندر ازلی و ابدی نارسائی کا گہرا احساس ہے۔ ان کی شاعری میں مہاجرت کی زندگی میں پیدا ہونے والی تنہائی سے ہول آتا ہے۔

منصور آفاق کی شاعری نئے عہد کے پنپنے والے احساسات وجذبات اور دیارِ غیر کی نئی طرز معاشرت کی نمائندہ ہے۔ دیارِ غیر بالخصوص برطانیہ کی تہذیب و معاشرت سے انہوں نے نہ صرف براہ راست اثر قبول کیا ہے بلکہ اس کا اظہار انگریزی لفاظی میں کر کے اردو شاعری کے دامن کو نئی نئی وسعتوں سے ہمکنار کیا ہے۔ اس نئے ماحول میں وہ تنہائی اور اجنبیت کو شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں جو ان میں ناسٹلجیائی جذبات کو تقویت بخشتے ہیں۔ جس میں وہ اپنی شناخت ماضی کی حسین یادوں میں تلاش کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جہاں اپنے پیاروں کو یاد کرتے ہوئے سینہ کوبی کرتے ہیں۔ خوشگوار لمحات کی تلاش کے حوالے سے وہ پر امید ہیں لیکن اب تک یہ تلاش ناخوشگوار ثابت ہوئی ہے۔ ان کی شاعری میں انسان کی ازلی ہجرت کے کرب سے لے کر عہد حاضرہ کی بیرونی ہجرتوں کا کرب شامل ہے۔ ملکی معاشی اتار چڑاؤ کی صورت حال کو دیکھ کر ایک طرح کی مایوسی ان کے ہاں بھی دکھائی دیتی ہے۔ ان کی شاعری میں برطانوی معاشرے میں وقت کی تیز رفتاری سے انسانی تہذیب کے مٹنے کا المیہ موجود ہے۔ اس میکانکی نظام میں انسان کے پاس اپنے لیے وقت نہیں بچتا۔ وقت کے اس جبر نے معاشرتی تعامل کا قتل کر دیا ہے۔ وقت کا یہ جبر احمد مشتاق کی طرح منصور آفاق کا بھی ایک اہم مسئلہ ہے۔ اپنوں کا فراق، عہد طفلی کی یادیں اور مشرقی خانگی نظام بھی ان کی شاعری میں ناسٹلجیا کی صورت میں دکھائی دیتا ہے۔

وطن اور بالخصوص گھر کی یاد دیگر شعراء کی طرح منصور آفاق کی شاعری میں بھی ملتی ہے۔ لیکن اس یاد میں دیگر شعراء سے زیادہ تڑپ کی ایک کیفیت موجود ہے۔ برطانوی معاشرت میں انہیں ملک کی اہمیت کا اندازہ ہوا ہے اس واسطے وہ ہم وطنوں کو وعظ دیتے ہوئے خوش حالی، امن اور ملک کو سنبھالنے کی تلقین کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ مہاجرت کا عذاب جھیلنے کے باوجود انہیں بہتر معاشرے میں بھی رائیگانی کا احساس اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے۔ دیارِ غیر میں تارکین وطن کے جذبات کی بھرپور عکاسی کرتے ہوئے ملکی حالات پر نوحہ کناں دکھائی دیتے ہیں اور ملک کے مستقبل کے لیے بہتر قائد کے لیے دعا گو ہیں۔ ان کی شاعری میں وطن اور اس سے جڑی اشیاء سے محبت کا اظہار بے ساختہ انداز میں ملتا ہے۔ جس میں وہ اپنے چمن کے برگ و سمن اور زبان کو جہاں بھر سے ممتاز سمجھتے ہیں۔ برطانیہ چونکہ سرد ملک ہے یہاں کے لوگوں کے جذبات و احساسات بھی سرد دکھائی دیتے ہیں۔ ایسے میں منصور آفاق اپنے ملک کی سرزمین، موسموں کے تغیر اور زبان کو شدت کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔ تہذیبی و ثقافتی تنوع دیگر شعراء سے زیادہ منصور آفاق کی شاعری میں ملتا ہے۔ اس تنوع میں زبان کے تجربات اولیت کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری میں آبائی وطن اور اس کے گلی کوچوں سے بے لوث انسیت کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ جو غریب الوطنی کی زندگی میں ناسٹلجیا کی صورت میں وقوع پذیر ہوئی ہے۔ ان یادوں میں میانوالی شہر کی یادیں جابجا

بکھری ہوئی ہیں۔اس کے علاوہ ملک کی حسین وادیوں کے قدرتی مناظر کی جھلکیاں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ منصور آفاق انہیں مناظر کو دوبارہ دیکھنے کے متمنی ہیں۔ غریب والوطنی کی زندگی میں ماحول میں اجنبیت کا احساس، ازلی و ابدی نارسائی، افسردگی اور تنہائی کے جذبات کا اظہار بھی ان کی شاعری میں ملتا ہے۔

علی ارمان کی شاعری میں ہجرت کا کرب جھیلتے ہوئے وطن کی یادیں دل کے اندر آگ لگاتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ صنعتی ترقی نے انسان کی انفرادیت ختم کر دی ہے۔ انفرادیت کی جگہ اجتماعیت نے لے لی ہے۔ جس سے تشخص کے مسائل نے جنم لیا ہے۔ علی ارمان کی شاعری میں شہر اور گاؤں کے استعاروں کی مدد سے ایک ایسی تہذیب کی کھوج لگائی گئی ہے جو ماضی میں پنہاں ہے۔ جہاں انسان کی اپنی پہچان موجود ہے۔ان کی شاعری برطانیہ جیسی بہترین سوسائٹی میں حالات وواقعات کی تلخیوں پر نوحہ کناں ہے۔یہ تلخیاں ان میں شدید قسم کا ناسٹلجیا پیدا کرتی ہیں۔ جس میں وہ اپنے ماضی کو یاد کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔اس کے علاوہ ان کی شاعری میں برطانیہ کی انفرادی زندگی کے برعکس پاکستانی خانگی نظام کی یادیں بھی ملتی ہیں۔ برطانوی ماحول میں پیدا ہونے والے مسائل اور ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ڈر وخوف کی صورت حال میں بے یقینی اور لاتعلقی کا احساس بھی ان کی شاعری میں ملتا ہے۔ان کے ہاں ہجرتوں کے نتیجے میں انسانی تاریخ میں انسان کے مسلسل سفر کی صورت میں بھی ناسٹلجیا دکھائی دیتا ہے۔ان کی شاعری میں اپنوں کے وصل کی ایک امید ملتی ہے۔ جو ہجر کے لمحات کاٹنے کے لیے توانائی کا کام کرتی ہیں۔انہی یادوں میں عہد طفلی کی حسین یادیں بھی شامل ہیں جو تلاش معاش کی نظر ہو گئی ہیں۔

علی ارمان کی شاعری میں برطانوی روزمرہ زندگی سے تنگی، بوریت اور اکتاہٹ کا عنصر ملتا ہے۔ جس میں وطن کی یاد نمایاں ہے۔ ان یادوں میں وطن کی سمت مراجعت کا عنصر بھی ملتا ہے۔ ان کی شاعری میں برطانوی معاشرے میں محبوب وطن کے گلی کوچے اور پرانے رستوں کی خواہش کے حوالے سے پاکستانی تارکین وطن کے جذبات کی عکاسی کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔وہ ان پرانے رستوں اور گلی کوچوں میں دوبارہ سانس لینے کی خواہش کرتے ہیں ۔جہاں ان کا بچپن، لڑکپن اور جوانی کے ایام گزرے ہیں۔ برطانوی ماحول میں صنعتی ترقی نے مظاہر فطرت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے جس میں آبائی وطن کے قدرتی مناظر کی یادیں، ان سے محبت وعقیدت کا تعلق مناظر اوران کو دوبارہ دیکھنے کی خواہش علی ارمان کی شاعری میں ملتی ہے۔اس کے علاوہ ان کی شاعری برطانوی ماحول سے پیدا ہونے والی افسردگی اور تنہائی کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔

ب۔ تحقیقی نتائج:

۱۔پاکستانی تارکینِ وطن کے ترک وطن کی وجوہات میں تعلیمی، سیاسی، سماجی، ثقافتی، تہذیبی اور سب سے اہم وجہ معاشی آسودگی ہے۔

۲۔پاکستانی تارکینِ وطن کی شاعری میں ناسٹلجیا کے تحت مجموعی طور پر یادِ ماضی کے عناصر میں یادِ ماضی، ہجرت کا کرب، تشخص کی تلاش، انسانی رشتوں کا انہدام، بیرونی ہجرتیں، بے یقینی اور لاتعلقی کا احساس، اپنوں کی جدائی کا دکھ اور دوستوں کی یادیں پائی جاتی ہیں۔

۳۔ پاکستانی تارکینِ وطن کی شاعری میں ناسٹلجیا کے تحت مجموعی طور پر مراجعت کی خواہش میں گھر سے دوری کا احساس، اجنبیت کا احساس، حب الوطنی، قدیم آبائی وطن، فطرت پسندی، ازلی و ابدی نارسائی، غریب الدیار، اداسی، ستم رسیدگی اور تنہائی کے عناصر پائے جاتے ہیں۔

۴۔ تحقیق کے دوران کلے روٹلیج کے تصورات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا گیا ہے کہ ناسٹلجیا سے سماج میں اپنائیت، ہمدردی، نئے تعلق کو تلاش کرنے کی حوصلہ افزائی، سماجی روابط میں پیدا ہونے والے مسائل کا حل اور مشترکہ انسانیت کو بھی فروغ دیا جا سکتا ہے۔

ج۔سفارشات:

۱۔برطانیہ اور امریکا کے علاوہ دیگر ممالک کے پاکستانی تارکینِ وطن کی شاعری میں ناسٹلجیا کا تحقیقی مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

۲۔شاعری کے علاوہ تارکینِ وطن کی نثری اصناف میں بھی ناسٹلجیا کے حوالے سے تحقیقی کام کرنے کی ضرورت ہے۔

۳۔ منتخب شعراء کی شاعری میں ناسٹلجیا کے علاوہ بین الاقوامی رجحانات کے تناظر میں دیگر موضوعات کے حوالے سے تحقیقی و تنقیدی کام کیا جاسکتا ہے۔

۴۔ پاکستانی تارکین وطن کی شاعری کو اسلوبیاتی حوالے سے بھی دیکھنے کی ضرورت ہے تاکہ یہ دیکھا جاسکے کہ اجنبی زبانوں کے ملاپ سے کیا نئی اضافتیں اردو شاعری میں ہو رہی ہیں۔

۵۔ پاکستانی تارکینِ وطن کی شاعری میں غیر ملکی تہذیبی و ثقافتی اثرات کے حوالے سے بھی تحقیقی کام کرنے کی ضرورت ہے۔

کتابیات

بنیادی ماخذ:

احمد مشتاق، مجموعہ: احمد مشتاق، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۱ء

ساقی فاروقی، غزل ہے شرط، اکادمی بازیافت، ۲۰۰۴

ساقی فاروقی، سرخ گلاب اور بدر منیر (تمام نظمیں، تمام غزلیں)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵ء

ساقی فاروقی، زندہ پانی سچا پانی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۲ء

علی ارمان، مجھے چاند چاہیے، خزینہ علم و ادب، لاہور، ۲۰۰۰ء

منصور آفاق، دیوانِ منصور، وراق ی مرکز، لاہور، ۲۰۱۴ء

ثانوی ماخذ:

ابو اللیث صدیقی، لکھنوء کا دبستان شاعری، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۹۴ء

ابو الاعجاز حفیظ صدیقی، ادبی اصطلاحات کا تعارف، اسلوب، لاہور، ۲۰۱۵ء

احمد سہیل، اردو افسانے کا ناسٹلجیا، ملتان: تدوین پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء

اظہر فراغ، ازالہ، وراق پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۶ء

القران، سورۃ النساء

انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں (ابتدائی دور سے ۱۹۴۷ء تک)، انجمن ترقی اردو، ۱۹۹۶ء

ٹی۔این۔راز، مرتبہ، رنگارنگ اردو شاعری (سب رس اور سدا بہار موضوعاتی انتخاب)، عبارت پبلی کیشنز، ۲۰۲۱ء

جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو، جلد دوم، مجلس اردو ادب، لاہور، ۱۹۸۷ء

جواز جعفری، ڈاکٹر، اردو ادب یورپ اور امریکہ میں، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۲۰۱۰ء

خوشحال زیدی، ڈاکٹر، اردو کی درسی کتب میں حب الوطنی، کلر پریس، دہلی، ۱۹۹۹ء

رشید امجد، ڈاکٹر، پاکستانی ادب رویے اور رجحانات، پورب اکادمی، ۲۰۱۰ء

رشید محمود، راجہ، تحریک ہجرت، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۵ء

ساقی فاروقی، آپ بیتی / پاپ بیتی، اکادمی بازیافت، ۲۰۰۸ء

شیر علی، ڈاکٹر، برطانیہ میں اردو شاعری کی روایت (آغاز تا عصرِ حاضر)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۲ء

صبیحہ ناہید، ڈاکٹر، اردو نظم میں مناظر فطرت، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی، ۲۰۱۹ء

عارف ثاقب، انجمن پنجاب کے مشاعرے، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۵ء
عامر سہیل، سید، علی اظہر، ڈاکٹر، مرتبین، قراۃ العین حیدر: خصوصی مطالعہ، ملتان بیکن بکس، ۲۰۰۳ء
کلب علی خاں فائق، مرتبہ، کلیاتِ میر، جلد اول، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۸۶ء
کلب علی خاں فائق، مرتبہ، کلیاتِ میر، جلد سوم، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۹۲ء
گوپی چند نارنگ، ترتیب و تہذیب، اردو کی نئی بستیاں، ساہتہ اکادمی، ۲۰۰۶ء
محمد شمس الدین صدیقی، ڈاکٹر، مرتبہ، کلیات سودا، مجلس ترقی ادب، لاہور، س ن
محی الدین قادری زور، ڈاکٹر، مرتبہ، اردو شہ پارے، جلد اول، حیدر آباد دکن: مکتبہ ابراہیمیہ، ۱۹۲۹ء
مرزا حامد بیگ، جانکی بائی کی عرضی (ناسٹلجیا: لالہ جسونت کی حویلی)، دوست پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء
مشتاق احمد، مرتبہ، آدمی ہمارا (شعریاتِ احمد مشتاق)، پیس پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۹ء
مقیم الدین فاروقی، پاکستان کیوں ٹوٹا؟ کمیونسٹ پارٹی پبلی کیشن، دہلی، ۱۹۷۲ء
ناصر کاظمی، دیوان ناصر، القاپبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۱۶ء
نواب مرزا داغ دہلوی، یادگارِ داغ، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۸۴ء
نورالحسن ہاشمی، مرتبہ، کلیات ولی، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، س۔ن

رسائل وجرائد:

تہمینہ ناز، ناسٹلجیا کیا ہے؟، جرنل آف ریسرچ (اردو)، شمارہ ۳۱، ۲۰۱۷ء
تہمینہ ناز، ناول 'امراؤ جان ادا' میں ناسٹلجیائی رجحان: ایک مطالعہ، دریافت شمارہ ۱۲، نمل اسلام آباد
حنیف فوق، اردو غزل کے نئے زاویے، مشمولہ، فنون، لاہور، جدید غزل، جلد اول، جنوری ۱۹۶۹ء
شکیلہ جبین، انتظار حسین کی ناول نگاری میں ناسٹلجیائی عناصر، نورِ تحقیق (جلد: پانچ)، شمارہ ۱۸، شعبہ اردو، گیریژن یونیورسٹی، لاہور
قاضی جاوید، ناسٹلجیا کے بارے میں چند باتیں، مشمولہ: ماہ نو، اکتوبر ۱۹۸۱، س ن

لغات:

رنگین فیروز اللغات اردو جامع، مرتبہ الحاج مولوی فیروز الدین مرحوم، فیروز سنز پرائیوٹ لمیٹڈ، لاہور، س۔ن
سید احمد دہلوی، مرتبہ، فرہنگ آصفیہ، جلد سوم، چہارم (مشترک جلد)، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۲۰۱۰ء

مقالات:

انتل ضیاء، ۱۹۴۷ء کے بعد اردو کے نمائندہ افسانوں میں کرداری ناسٹلجیا کا تنقیدی جائزہ، ۱۹۴۷ء تا ۲۰۱۵ء، مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی، شعبہ جامع پشاور، ۲۰۱۳ء

ظفر حسین شاہ گیلانی، سید، مقالہ نگار، جدید اردو نظم کا بدلتا منظر نامہ: یوٹوپیا سے ناسٹلجیا تک، نمل یونیورسٹی، اسلام آباد، س۔ن

غزالہ شفیق، اردوناول میں ناسٹلجیا: قیام پاکستان کے بعد، مقالہ برائے ایم فل اردو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۱۳ء

نبی احمد، اردو غزل میں ہجرت کا تجربہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی، وفاقی اردو یونیورسٹی برائے فنون سائنس اور ٹیکنالوجی، اسلام آباد، س ن

انگریزی لغات اورانسائیکلوپیڈیا:

Advanced Practical Dictionary (English to English and Urdu) with brief General Knowledge, Azhar publishers Lahore, Pakistan, P:852, 2000

Dictionary of psychology.com, 26,Jan,2024

آن لائن انگلش ٹو اردو ڈکشنری، ۲۴ اگست ۲۰۲۳ء، www.dictionaryenglishtourdu.com، 8:00PM

Nostalgia.Dictionary.cambridge.org.http://Dictionary.Cambridge.org/Dictionary/English/ Nostalgia, 8, Jan, 2024, 2:25 PM

Nostalgia.Oxfordlearners distionaries.com, 2024

http://www.oxfordlearnersdistionaries.come/Difination/English/Nostlgia, 25, Jan,2024, 4:05 PM

http://ur.m.wikipedia.org 30.2.2024, 8:51 A.M

https://www.dictionary .com/browse/dytopia, 23, Aug,2023, 7:40 PM

انگریزی کتابیں:

Routledge, Cly Nostalfia: A Psychological Resource Routledge, 2015